قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چوہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اگست 2017ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ





طلوعِ اسلام کے قارئین کو

جشنِ آزادی مبارک

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہئے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (3:19)۔

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب' خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظام زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوع انسانی سے مخاطب اور اس کا رب' رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین' انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

اگست 2017ء

جلد 70 | شمارہ نمبر 08

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: نظامِ پاکستان کے متعلق	سلیم اختر	4
کیا ''پرویزیت'' کوئی فرقہ ہے؟	ملک منظور حسین لیل، بھکر	6
قرآن اور سائنس	غلام احمد پرویز	12
تقریب بیادِ پرویز	جعفر حسین، لاہور	19
آزادی کا قرآنی مفہوم	غلام احمد پرویز	26
دیت کا قرآنی مفہوم	خواجہ ازہر عباس، کراچی	38
قرآن: جدید تحقیقات کی روشنی میں	عبداللہ ثانی، پشاور	43
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	46
حیات بعد الممات یا حیات بعد الحیات	ڈاکٹر حامد میاں، نیویارک	52

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) **(Episode-2)**

Chapter 6: Tears of passion (*Shola-e-Namnaak* شعلہ نمناک) –

To my fellow travelers

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1962)

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) **59**

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 550 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام

B-25 گلبرگ 2، لاہور

54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546 , Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com

www.facebook.com/Talueislam

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد قرار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر وبیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂؐ بدر وحنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نم ناک می گردد
ببازارِ محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملت ما سازگار آمد
''بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم وطرحِ دیگر اندازیم''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

سلیم اختر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

نظامِ پاکستان کے متعلق

علامہ اقبالؒ کا خط قائداعظمؒ کے نام

پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کا دیا ہوا ہے۔ حصول پاکستان کے بعد، وہ پاکستان میں کس قسم کا نظام دیکھنا چاہتے تھے؟ اس کے متعلق انہوں نے اپنا نظریہ اُس خط میں واضح کیا تھا جو انہوں نے 28 مئی 1937ء کو قائداعظم کے نام تحریر فرمایا تھا۔ انہوں نے اس خط میں پہلے یہ بتایا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہونا چاہئے اور اس کے بعد یہ کہ اگر ان کے تصور کے مطابق مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم ہوگئی تو اس کا نظام کن خطوط پر متشکل ہونا چاہئے۔ 14 اگست کے حوالہ سے وہ خط یاددہانی کے لیے ایک دفعہ پھر خدمت عالی میں پیش کیا جارہا ہے:

''لیگ کو آخرالامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لیے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید (یعنی 1935ء کے آئین) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں، امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے وقف ہوجائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جارہا ہے۔ مسلمان محسوس کررہا ہے کہ وہ گذشتہ دوسو سال سے نیچے ہی نیچے جارہا ہے۔۔۔ اس لیے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (Devolopment) دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کردیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش (Subsistance) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ

کا کوئی حل نہیں۔ اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) کو اپنے ہاں قبول کرلیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ لیکن اسلام کے لیے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کرلینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرداف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کررہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔''

دیکھا آپ نے قارئینِ کرام! اِس خط میں مسلمانوں کے جو حالات تحریر کئے گئے ہیں 80 سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود جوں کے توں ہیں بلکہ زیادہ ابتر ہوئے ہیں۔ کیا ''جحیم'' اس کیفیت کا نام نہیں ہے؟ اِس خط میں جو تجویز پیش کی گئی ہے آج بھی وہی ہمارے دور کا درمان بن سکتی ہے۔ یعنی ایک فلاحی مملکت جس کا آئین قرآن کریم کے اصولوں پر مبنی ہو۔

؎ علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

دروس القرآن کی نئی جلدیں شائع ہوگئیں

1۔ سورۂ آلِ عمران (جلد اوّل)، صفحات: 500 تقریباً، قیمت: 500 روپے
2۔ سورۂ آلِ عمران (جلد دوم)، صفحات: 500 تقریباً، قیمت: 500 روپے
3۔ سورۃ المائدہ، صفحات: 450 تقریباً، قیمت: 500 روپے
4۔ سورۃ الانعام، صفحات: 600 تقریباً، قیمت: 600 روپے
5۔ سورۂ انفال، صفحات: 210 تقریباً، قیمت: 250 روپے
6۔ سورۂ توبہ، صفحات: 530 تقریباً، قیمت: 550 روپے
7۔ سورۂ ھود، صفحات: 400 تقریباً، قیمت: 400 روپے
8۔ سورۂ یوسف، صفحات: 300 تقریباً، قیمت: 300 روپے
9۔ سورۂ الرعد، ابراہیم، الحجر، صفحات: 500 تقریباً، قیمت: 500 روپے

ملنے کا پتہ:

ادارہ طلوعِ اسلام 25 بی گلبرگ 2 لاہور
Phone: 042-35714546, Cell: 0321-4460787

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پرویز صاحب اور اُن کے نظریات کا تعارف

(کچھ وضاحتیں)

کیا ''پرویزیت'' کوئی فرقہ ہے؟

فرقے کی پہچان:

طلوعِ اسلام فروری 1972ء، ص: 31، دوسرے لوگوں سے الگ خیالات ونظریات یا اختلافِ رائے رکھنا فرقہ بندی نہیں۔ اختلافِ مسجد ونماز فرقہ بندی ہے۔ ''فرقے کی پہچان بڑی آسان ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر فرقہ دوسروں سے الگ نماز پڑھتا ہے۔ لہٰذا، جو لوگ اپنی نماز الگ پڑھیں۔ سمجھ لیجئے کہ وہ الگ فرقہ سے متعلق ہیں۔ اکثر تو ہر فرقہ کی نماز ہی مختلف ہوتی ہے لیکن ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ نماز دوسروں سے مختلف نہ ہو، لیکن وہ لوگ نماز الگ پڑھیں۔ مثلاً جب ''احمدی'' اپنے آپ کو مسلمانوں کا فرقہ شمار کراتے تھے تو وہ نماز تو وہی پڑھتے تھے جو حنفی مسلمان پڑھتے ہیں۔ لیکن نماز پڑھتے تھے دوسروں (حتیٰ کہ حنفیوں) سے الگ۔۔ فرقوں کی یہ علامت ہماری وضع کردہ نہیں، قرآن کریم کی بیان فرمودہ ہے۔۔ خود رسول ﷺ کی زندگی میں، مدینہ میں ایک الگ مسجد تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کرنے والوں نے نہ اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا تھا، نہ ہی انہوں نے کوئی نئی نماز وضع کر لی تھی۔ لیکن ان کا (الگ مسجد بنانے کا) یہ جرم اس قدر سنگین تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کو فرو کرنے کے لئے سخت ترین الفاظ میں تاکید کی۔۔ اُس نے کہا کہ یہ مسجد نہیں، ان لوگوں کے لئے کمین گاہ ہے جو خدا اور رسول ﷺ کے خلاف جنگ کرنا چاہتے ہیں (وَاِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ 9:107)

ہم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ ان لوگوں نے اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار نہیں کر لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کریم نے ان کی مسجد سازی کو کفر قرار دیا (9:107)۔ اور حضور ﷺ سے ارشاد فرمایا کہ ''تم اس میں قدم تک نہ رکھنا۔'' (لَا تَقُمۡ فِیۡہِ اَبَدًا ؕ)۔ اور اس کے بعد کہا کہ یہ مسجد ان لوگوں کو جہنم میں لے جائے گی۔۔۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ جرم کیا تھا، جس کی پاداش میں ایسا کچھ کہا گیا۔ سنئے اور غور سے سنئے!۔۔ یہ جرم تھا۔ وَّتَفۡرِیۡقًۢا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (9:107)۔ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا۔ اور اس کی علامت کیا تھی؟۔ الگ مسجد!۔ یہی وہ فرقہ سازی ہے جسے قرآن کریم نے یہاں کفر، اور دوسرے مقام پر شرک کہہ کر پکارا ہے (30:31)۔۔ جب تک اسلام، دین کی شکل میں رہا، امت میں کوئی فرقہ پیدا نہ ہوا۔ یاد رکھئے

!وحدتِ امت، دین کی بنیادی شرط ہے۔ اگر یہ وحدت باقی نہ رہے تو پھر دین باقی نہیں رہتا۔ وہ دیگر مذاہب کی طرح مذہب بن جاتا ہے۔ ان فرقوں میں سے بہت سے مٹ مٹا گئے۔ اور بہت تھوڑے سے باقی رہ گئے۔ اس کے بعد جدید فرقہ سازی کی وباء ختم ہوگئی۔ لیکن اس نے ہمارے زمانے میں پھر سر نکالا۔ پہلے ''احمدیوں'' نے (اپنے آپ کو مسلمانوں کے ایک فرقہ کی حیثیت سے متعارف کرا کر) الگ نماز پڑھنا شروع کی۔۔ اور اس کے بعد ''فرقہ اہلِ قرآن'' نے ایک الگ نماز ایجاد کی اور باقی فرقوں سے الگ نماز پڑھنے لگے۔ اور اس کے لئے اپنی الگ مسجد بھی تعمیر کر لی۔ ''احمدیوں'' کے غیر مسلم قرار پا جانے سے ان کا شمار مسلمانوں کے فرقوں میں نہ رہا۔ وہ ''فرقہ'' یوں ختم ہو گیا۔ باقی رہے ''اہلِ قرآن''، سو وہ چند دنوں کا کھیل ہے۔ اس فرقہ میں باقی رہنے کی سکت نہیں۔ یہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔۔۔ جو باقی فرقے چلے آ رہے ہیں، بحالاتِ موجودہ ان کے مٹ کر، امتِ واحدہ بن جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر ہماری کوئی ایسی مملکت وجود میں آ گئی، جس نے اسلام کو پھر سے ''دین'' کی شکل میں متمکن کر دیا، تو اُس وقت اس امتِ متفرقہ کا امتِ واحدہ میں تبدیل ہو جانے کا امکان ہوگا۔۔۔ اگر ایسا نہ ہوا، تو پھر اسلام، دین کی شکل اُس قوم میں اختیار کر سکے گا جو پہلے پہل مسلمان ہوگی اور قرآن مجید کی بنیادوں پر مملکت قائم کرے گی۔۔۔ ہمارا ایمان ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ کیونکہ خدا کا اعلان ہے کہ یہ دین غالب آ کر رہے گا۔

پرویزی فرقہ:

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ جو طلوعِ اسلام، فرقہ سازی کو (از روئے قرآن) شرک قرار دیتا ہو، کیا وہ خود ایک فرقہ بنائے گا؟۔ جو لوگ ''پرویزی فرقہ'' کی رٹ لگاتے ہیں، آپ ان سے پوچھئے کہ اس مبینہ ''فرقہ'' کے لوگ کون سی الگ نماز پڑھتے ہیں اور ان کی علیٰحدہ مسجد کون سی ہے!۔ الگ مسجد بنانا تو ایک طرف، اس باب میں طلوعِ اسلام کی احتیاط کا تو یہ عالم ہے کہ یہ اپنی کنونشن میں بھی جلسہ گاہ یا قیام گاہ میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ شرکاء سے تاکید کرتا ہے کہ وہ قرب و جوار کی مساجد میں جا کر نماز پڑھیں۔۔ لیکن اس کے باوجود، یہ حضرات ''پرویزی فرقہ'' کی رٹ برابر لگائے جائیں گے۔ اس کی خاص وجہ ہے۔۔ جب سے مسلمانوں میں فرقے پیدا ہونے شروع ہوئے، یہ آواز طلوعِ اسلام کی طرف سے پہلی بار بلند ہوئی کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ سازی شرک ہے۔ اس سے پہلے ہوتا یہی تھا (اور اب بھی یہی ہو رہا ہے) کہ ہر فرقہ، دوسرے فرقوں کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرتا تھا اور اپنے آپ کو صحیح اسلام کا پابند اور ''ناجی'' قرار دیتا تھا۔ جب طلوعِ اسلام کی طرف سے یہ آواز بلند ہوئی تو ظاہر ہے کہ اس کی مخالفت تمام فرقوں کی طرف سے ہونی تھی۔ اس کی مخالفت تو ان سب نے کی۔۔ لیکن طلوعِ اسلام کی طرف سے قرآن کریم کی جو آیات پیش کی جاتی تھیں (جن میں اس نے فرقہ بندی کو کفر اور شرک قرار دیا ہے) ان کا جواب، ان سے بن نہیں پڑتا تھا۔۔۔ بالآخر انہوں نے زچ ہو کر، اس کا علاج یہ سوچا کہ مشہور کر دیا جائے کہ طلوعِ اسلام کا بانی ''پرویز'' ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے۔ طلوعِ اسلام اس پر بھی قرآن کریم کی آواز بلند کرنے سے نہ رکا اور ان حضرات سے کہتا رہا کہ اس بحث کو چھوڑیئے کہ طلوعِ اسلام ایک فرقہ ہے یا نہیں، آپ یہ فرمایئے کہ

قرآن کریم کی رو سے فرقہ سازی شرک ہے یا نہیں۔اور جو امت فرقوں میں بٹ جائے، کیا اس میں اسلام اپنی اصل شکل میں باقی رہ سکتا ہے؟۔اس کا ان کے پاس گالیوں کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔

مکتبِ فکر، ایک خوش فہمی:

جب یہ اس طرح سخت تنگ آ گئے تو کوئی نہایت ہوشیار سیاسی ذہن آگے بڑھا اور اس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ تم کہو کہ مسلمانوں میں کوئی فرقہ ہے ہی نہیں، یہ سب مختلف ''مکاتبِ فکر'' ہیں۔فرقہ کا نام ''مکتبِ فکر'' رکھا اور اس فریبِ نفس یا ابلہ فریبی سے مطمئن ہو گئے کہ ہم اس الزام سے بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ان کی بدستور الگ الگ نمازیں ہیں۔الگ الگ مساجد۔الگ الگ شریعت۔لیکن اس کے باوجود فرقے نہیں، ''مکاتبِ فکر'' ہیں!۔۔۔اور طلوعِ اسلام، جس کی نہ کوئی الگ نماز ہے، نہ الگ مسجد، نہ الگ شریعت، نہ کوئی الگ دعویٰ، فرقہ ہے ا۔یا للعجب!''۔تھوڑا سا آگے چل کر لکھتے ہیں۔۔ ''ہم ان خود فریبوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ فرقوں کا نام مکاتبِ فکر رکھ لینے سے کیا آپ کے وہ جھگڑے ختم ہو گئے جو صدیوں سے چلے آ رہے ہیں؟''۔''اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ (اور نمازیں تو چھوڑیئے!۔کیا) آپ کے ان ''مکاتبِ فکر'' نے گزشتہ عید کی نماز بھی کسی ایک جگہ مل کر پڑھی ہے؟۔۔۔یا کیا آپ نے کفر کے وہ فتوے واپس لے لئے ہیں جو آپ نے ایک دوسرے فرقے کے خلاف لگائے تھے؟''۔

مکاتبِ فکر:

طلوعِ اسلام مئی، جون 1982ء، ص:39، ''ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے اور اختلاف کو خدا کے غضب کا موجب۔جب ان آیاتِ قرآنی کو بہ تکرار و اصرار سامنے لایا گیا جن میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے، تو یہ حضرات بڑی مشکل میں پھنس گئے۔ان کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں تھا۔اس سے ذرا سی امید بندھتی تھی کہ شاید یہ حضرات اپنی روش پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں، اور سوچیں کہ اس شرک کو توحید سے کس طرح بدلا جا سکتا ہے لیکن (معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ) یہ فرقے ہیں ہی نہیں۔یہ مکاتبِ فکر ہیں۔۔اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے یہ حضرات بہت خوش ہو گئے کہ اب ہم فرقوں کے پابند رہتے ہوئے بھی، مشرک قرار نہیں پائیں گے!۔یعنی رام داس کا نام عبدالرحمان رکھ دینے سے سمجھ لیا کہ وہ کافر نہیں رہا، مسلمان ہو گیا ہے!۔''

نمازوں کا اختلاف:

طلوعِ اسلام مئی، جون 1982ء، ص:39، ذرا مکاتبِ فکر اور فرقوں کے فرق پر غور فرمایئے۔ہمارے ہاں بڑے بڑے مشہور مفکر (فلاسفر) گزرے ہیں۔(مثلاً) بوعلی سینا، فارابی، رازی، الکندی وغیرہ۔۔ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا ''مکتبۂ فکر (School of thought) تھا۔کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ بوعلی سینا کے مکتبۂ فکر کے پیرو اپنی الگ نماز پڑھتے تھے اور فارابی کا مکتبۂ فکر الگ نماز!۔کیا آج مسلمانوں کے ممالک میں کہیں کوئی گروہ ایسا ہے جو بوعلی سینا کے طریق پر نماز ادا

کرتا ہو یا فارابی کے طریق پر!۔۔۔ان کے برعکس ذرا فرقوں پر نگاہ ڈالئے۔ بخاریؒ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔۔۔صلوا کما رایتمونی اصلی (کتاب الاذان)۔

''تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو''۔۔اگر یہ روایت نہ بھی ہوتی تو بھی بات واضح تھی کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ ساری عمر نمازیں ادا فرمائیں۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ حضور ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا بلکہ خود بھی اسی طرح نماز پڑھتے رہے۔۔اس کے بعد آج تک نہ تو اُمت میں ذرا سا بھی انقطاع (Gap) واقع ہوا۔۔یعنی یہ حادثہ ایک لمحہ کے لئے بھی رونما نہیں ہوا کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمان نہ رہے ہوں۔۔نہ ہی کبھی نماز کا فریضہ ترک کیا گیا۔۔بالفاظِ دیگر، لاکھوں مسلمانوں نے حضور ﷺ کے ساتھ، حضور ﷺ جیسی نماز ادا کی۔اور اس کے بعد اس عملِ محسوس کا تسلسل آج تک جاری ہے۔۔۔اس سے عام سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ عملِ محسوس آج بھی بعینہٖ ویسا ہونا چاہیئے جیسا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا!۔۔لیکن امر واقعہ کیا ہے؟۔ یہ کہ مسلمانوں میں متعدد فرقے ہیں اور ہر فرقے کی نماز الگ الگ ہے۔اور طرفہ تماشا یہ کہ ہر فرقہ کا دعویٰ ہے کہ جو نماز وہ ادا کرتے ہیں وہ بعینہٖ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ ادا فرماتے تھے!۔کیا عقلِ سلیم اسے باور کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے؟۔ یہ فرقے کس طرح ثابت کرتے ہیں کہ ان کی نماز، جزئیات تک، رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے؟۔احادیث کی رو سے۔فقہ کی رو سے۔مختلف حدیثیں اور فقہی احکام، ہر فرقہ کی نماز کی تائید میں سند پہنچا دیتے ہیں۔اس کے بعد ان میں بحث اس امر پر چل پڑتی ہے کہ تمہاری حدیث ضعیف ہے اور ہماری صحیح۔'' یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی عبادات کے اوقات بھی مختلف ہیں (مؤلف)۔

طلوعِ اسلام فروری 1984ء، ص:3: ''تشکیلِ پاکستان کے وقت علّامہ اقبال ہم میں موجود نہ تھے۔طلوعِ اسلام نے اپنا فریضہ قرار دیا کہ وہ بتائے کہ فرقہ بندی کس طرح اسلام کے خلاف ہے۔اور پاکستان کا مقصود کتاب اللہ کو مرکزِ اطاعت قرار دے کر، فرقوں کی جگہ اُمتِ واحدہ کی تشکیل ہے۔طلوعِ اسلام نے اس حقیقت کو قرآن مجید کی نصوصِ صریحہ کی روشنی میں اس شد و مد اور اصرار و تکرار سے واضح کیا کہ لوگوں نے علماء حضرات سے پوچھنا شروع کر دیا کہ ان آیاتِ قرآنی کی موجودگی میں فرقوں کا وجود کس طرح باقی رہ سکتا ہے۔ان کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا۔اور امید کی جا سکتی تھی کہ وہ (زچ آ کر ہی سہی) اعترافِ حقیقت پر مجبور ہو جائیں گے۔۔۔لیکن (قرآن نے جو کہا ہے کہ: فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ ۔۔۔(16:63)۔''شیطان لوگوں کے غلط کاموں کو خوشنما بنا کر دکھا دیا کرتا ہے۔'')، کسی نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ یہ فرقے ہیں ہی نہیں، ''مکاتبِ فکر'' ہیں۔اس لئے تم گھبراؤ نہیں۔اپنی روش پر چلے جاؤ۔۔۔اس طرح، ایک لفظ کی تبدیلی سے، کفر کو اسلام اور شرک کو توحید بنا دیا، اور وہ جو فرقہ بندی کے خلافِ اسلام ہونے کے احساس سے کبھی دل میں خلش پیدا ہونے کا امکان تھا، وہ بھی نہ رہا۔اور یہ حضرات (كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۳۲ (30:32) کے

قرآنی ارشاد کے مطابق) اپنی اپنی خلافِ اسلام روش پر مطمئن ہو کر چلتے رہے۔۔۔اس طرح پاکستان کا، اختلاف وافتراق ختم کرنے کا پروگرام قدمِ اول ہی پر نسیاً منسیاً ہو گیا بلکہ نہ صرف نسیاً منسیاً ہو گیا بلکہ قرآنی قوانین کی جگہ فقہی قوانین کو بطور قوانینِ مملکت نافذ کرنے سے، فرقوں کی جڑیں اور بھی مضبوط ہو گئیں۔''

مولانا مودودی مرحوم:

ترجمان القرآن، اکتوبر، 1980ء، انٹرویو نمبر، ص: 52، ''جب تک جماعتِ اسلامی کے کارکن اور متفقین عام مسلمانوں کے ساتھ مسجدوں میں نمازیں ادا کر رہے ہیں اُس وقت تک کوئی معقول آدمی جماعت اسلامی پر یہ الزام چسپاں نہیں کر سکتا کہ وہ ایک فرقہ بن رہی ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی پر فرقہ بننے کا الزام وہ لوگ رکھتے ہیں جنہوں نے خود اپنی الگ الگ مسجدیں بنا رکھی ہیں اور اپنے مسلک کے خلاف مسلک رکھنے والوں سے اپنی نمازیں الگ کر لی ہیں۔ جب کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگ عام مسجدوں میں سب کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔'' صاف ظاہر ہے کہ مولانائے محترم بھی الگ نماز اور الگ مسجد کو (بمطابق قرآن کریم) فرقہ بندی کے شرکِ عظیم (9:107-109) کی علامت سمجھتے تھے۔ اگرچہ یہ امر موجبِ صد حیرت ہے کہ جماعتِ اسلامی نے اپنے مرکز منصورہ سمیت الگ مساجد کا اہتمام کر رکھا ہے اور کئی مقامات پر پہلے سے قائم شدہ مساجد پر قبضہ کر رکھا ہے جہاں فقہ حنفی کے مطابق نماز ادا کی جاتی ہے جس کی وجہ سے بجا طور پر یہ تاثر ابھرتا ہے جماعتِ اسلامی (اہلِ سنت یعنی دیوبندی اور بریلوی کی طرح) ایک الگ فرقہ بن چکی ہے۔

(جاری ہے)

قرآنی تعلیم

آپ قرآنی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کا ولولہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یہ بڑی مبارک بات ہے لیکن قرآن کریم کا صحیح مفہوم ہماری سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا تو یہ ذہنی تفریح سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر اس سے ہمارے قلب کی گہرائیوں میں کوئی ایسا انقلاب پیدا نہیں ہوتا جس کی جھلک ہماری روزمرہ کی زندگی میں نہ پائی جائے تو ایسی قرآن فہمی محض مشاعروں کی داد ہے۔ جس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

خِرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل و نگاہ کی اس مسلمانی کا مظاہرہ ہماری رفتار و گفتار و کردار سب میں ہونا چاہئے اگر ہماری سیرت پاکیزہ، نگاہ بلند، کردار پختہ اور معاملات صاف نہیں تو ہم میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے جن کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی تعلیم کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے بجز اس کے کہ ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیں کہ ہم ان سے بہت آگے ہیں۔ کیونکہ ہم قرآنی تعلیم کو ان سے بہتر سمجھتے ہیں، قرآن کو سمجھنے والوں کی زندگیاں ایسی ہونی چاہئے جن سے وہ چلتے پھرتے دوسروں سے ممتاز اور متمیز نظر آئیں اور جس کسی کو ان سے کبھی واسطہ پڑے وہ ان کے حسنِ معاملہ سے متاثر ہو کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ ؎

دیدہ ام مردے دریں قحط الرجال

(پرویز، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۃ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----				
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	----	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-				

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) 25-بی، گلبرگ 2، لاہور فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گذشتہ سے پیوستہ

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ

قرآن اور سائنس

(وہ نکتہ جس میں ملتِ اسلامیہ کی زندگی اور ارتقاء کا راز پوشیدہ ہے، اور جس کے خلاف عالمگیر سازش ہو رہی ہے)

سرسیدؒ نے علومِ جدیدہ کی تحصیل کی جو اہمیت قوم کے سامنے پیش کی تھی، اس کا تصور تو آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا لیکن اقوامِ مغرب کے لیے وہ کسی خاص خطرہ کا موجب نہیں تھا۔ اب جو مسلمانوں کے مختلف ممالک آزاد ہوئے اور زمانے کے تقاضوں نے ان پر علومِ جدیدہ، بالخصوص سائنٹیفک علوم کی تحصیل کی اہمیت کو شدت سے واضح کیا، تو اس سے ان اقوام کو خطرہ محسوس ہوا، اور انہوں نے سر جوڑ کر اس کے سدِ باب کی تدابیر کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ گہری سوچ اور بچار کے بعد، وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمان مذہب پرست قوم ہے۔ اگر ان میں اس احساس کو شدید کر دیا جائے کہ اصلی اسلام وہی ہے جو ان کے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا اور جو صدیوں سے متواتر چلا آ رہا ہے۔ اور جدّت پسندیاں، الحاد اور بے دینی کی طرف لے جاتی ہیں، تو یہ خطرہ ٹل سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی اس سکیم کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں ان کی نہایت اہم نظم ــــــ ابلیسؔ کی مجلسِ شوریٰ ــــــ اقوامِ مغرب کی اسی سکیم کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے لیکن آج کل اس نے جو خصوصی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس کے پیشِ نظر اس کا دہرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس نظم میں کہا گیا ہے کہ جب ابلیسؔ کے مشیروں نے اس کی توجہ اس خطرہ کی طرف مبذول کی تو اس نے کہا کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیںؔ
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

اس پر انہوں نے پوچھا کہ اس خطرہ کے سدِ باب کے لیے ہمیں کرنا کیا چاہئے، تو اس نے کہا کہ اس کے لیے پروگرام یہ ہے کہ ؎

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات — ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات؟

اس کے لیے کرنا یہ چاہئے کہ اسے اس قسم کے مسائل میں اُلجھائے رکھو کہ ؎

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟ — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیح ناصریؑ مقصود ہے؟ — یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریمؑ کے صفات؟

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم؟ اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بے گانہ رکھو عالمِ کردار سے! تابساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اور آخر میں اس نے کہا کہ ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اِسے!

اقبالؒ نے یہ کچھ 1937ء-1936ء میں کہا تھا۔ اور اقوامِ مغرب اسی قوت سے اس پروگرام کی پخت و پز میں لگ گئی تھیں۔ میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ اس تمام دوران میں یہ اقوام کس کس رنگ میں اس پروگرام کو نہایت خاموشی سے اور غیر محسوس طور پر آگے بڑھاتی رہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، پروگرام یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اس فریب کو راسخ کر دیا جائے کہ حقیقی اسلام وہی ہے جو مذہب کے نام سے ان کے ہاں مروج چلا آ رہا ہے۔ دین کی طرف دعوت، جو قرآن مجید میں محفوظ ہے، بدعت ہے۔ الحاد ہے۔ بے دینی ہے۔ ان کی یہ سکیم محوِخرام تو ایک عرصہ سے تھی لیکن گذشتہ دو تین سالوں سے عالمگیر حیثیت اختیار کر رہی ہے۔ یہ اس لئے کہ مسلم ممالک بالخصوص پاکستان میں، اسلامی نظام قائم۔۔۔ کرنے کا خیال اُبھرا تو انہیں خدشہ پیدا ہوا کہ اگر یہ بالخصوص پاکستان میں، اسلامی نظام قائم۔۔۔ کرنے کا خیال اُبھرا تو انہیں خدشہ پیدا ہوا کہ اگر یہ نظام علامہ اقبالؒ کے تصور کے مطابق قائم ہو گیا تو ان کا سیاسی اور معاشی نظام تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسلم اقوام کو اس طرف آنے ہی نہ دیا جائے اور انہیں اس نظامِ کہن کی بھول بھلیوں میں الجھا دیا جائے جو فلاح و بہبود کی راہ ان کے سامنے کشادہ ہی نہ ہونے دے۔ اس سے پہلے اقوامِ مغرب، مسلمان مذہب پرستوں کو قدامت پرست (Conservatists) اور جہالت پسند (Obscurantist) کہا کرتی تھیں۔ ان القابات میں نفرت اور حقارت پائی جاتی تھی اس لئے انہوں نے اپنے جدید پروگرام کے لیے نام بھی جدید تجویز کیا۔ یعنی (Fundamentalism) اور اس کے داعیوں کو (Fundamentalists) کہہ کر پکارنے لگے۔ ان اصطلاحات کے لئے ابھی تک اردو میں کوئی موزوں اصطلاح تراشی نہیں گئی۔ اس تحریک کو انہوں نے اس قدر پھیلایا ہے کہ قریب قریب ہر مسلمان ملک میں اس کی شاخیں قائم ہیں اور وہاں کے نامور پیشوایانِ مذہب اور قدامت پسند پیشہ ور اس کے ساتھ منسلک ہیں۔ مغرب اپنی تحریکوں کو پھیلانے کے لیے اخراجات کی طرف نہیں دیکھا کرتا۔ اس لئے یہ حضرات دولت لوٹ بھی رہے ہیں اور لٹا بھی رہے۔۔۔ یہ حضرات بڑے فخر سے اپنے آپ کو فنڈامینٹل ایسٹ کہتے ہیں کیونکہ مولوی کا لفظ قیانوسی سا ہو گیا ہے اور فنڈامنٹلسٹ میں جدّت پائی جاتی ہے۔ جن اقوام نے یہ اختراع وضع کی ہے ان کے ہاں اس کا مفہوم کیا ہے یہ ہم سے نہیں، انہی سے پوچھئے۔ پچھلے دنوں امریکہ کے

ایک پروفیسر (Dr. Bruce, B- Laurence) پاکستان آئے ہوئے تھے۔ یہ صاحب، ڈیوک یونیورسٹی، ڈرھم میں ریلیجن کے پروفیسر اور عربی اور اسلامی مطالعاتی پروگرام کے مشیر ہیں۔ ان کا ایک انٹرویو، کراچی کے روزنامہ ڈان کی 11 جون کی اشاعت میں شائع ہوا تھا جس کے دوران ان سے پوچھا گیا کہ ان کے نزدیک فنڈامینٹل ازم کا مفہوم کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ:

> اس تحریک کے ساتھ وابستگان کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ یہ، غیر مسلموں ہی کی نہیں۔ خود اپنے مسلمان بھائیوں کی بھی کسی بات کو برداشت نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ فنڈامینٹل ایسٹ وہ ہے جو اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ صرف اس کا نقطۂ نظر اور مسلک صحیح ہے اور باقی سب گمراہ ہیں۔ وہ مصر کے اخوان المسلمین ہوں یا ایران کے مجاہدین ان کا طرزِ عمل متصلب (بے لچک) ہوتا ہے اور کسی دوسرے کی بات ماننے کی ان کے ہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید اپنے ہر دعویٰ کو دلائل کی رُو سے پیش کرتا اور مخالفین سے بھی کہتا ہے کہ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ (27:64) تم بھی اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل پیش کرو۔ لیکن جہالت اپنے دعویٰ کو تعصب کی بنا پر پیش کرتی، اور دھاندلی سے منواتی ہے۔

اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو، فنڈامینٹل ازم کی مبہم اصطلاح کا فریب دے کر، پھر سے ازمنہ ٔمتوسطہ (Medieval Ages) کی طرف لوٹا دیا جائے اور اس اسلام کا احیاء کیا جائے جو ان کے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

آپ اس پر غور کیجئے کہ اسلام کے نام سے جو قوانین پاکستان میں مرتب ہو رہے ہیں، ان کی بنیاد وہی فقہ اور روایات ہیں جو عباسیوں کے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوئیں تھیں۔

پاکستان میں قانون سازی:

پہلے یہاں حدود (سزاؤں) سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے جو اُسی فقہ پر مبنی تھے۔ ان کے نفاذ کے چند ہی دن بعد کچھ امریکی صحافی سابق صدرِ پاکستان (ضیاء الحق) سے ملنے کے لئے آئے تو انہوں نے کہا کہ جو اسلامی قوانین آپ نے نافذ کئے ہیں وہ تو تاریخ کے عہدِ بربریت کی یاد تازہ کراتے ہیں۔ صاحبِ صدر نے جواب میں کہا کہ ان کے ساتھ ایسی شرائط وابستہ ہیں جن کی رُو سے نہ وہ قوانین نافذ ہوں گے، نہ کسی کو یہ سزائیں مل سکیں گی۔ آپ غور فرمائیے کہ اس سے دنیا اسلام کے متعلق کیا تصور قائم کرے گی؟ پھر یہاں زکوٰۃ کے متعلق قانون نافذ کیا گیا جس کے خلاف احتجاج ہوا تو فیصلہ کیا گیا کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق خود ہی زکوٰۃ ادا کر دیا کرے۔ وہ اس قانون سے مستثنیٰ ہیں البتہ جو لوگ اپنے آپ کو قرآن کا پابند قرار دیں گے وہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔ رجم (سنگساری) کے خلاف وفاقی شرعی عدالت نے پہلے یہ فیصلہ دیا کہ یہ سزا اسلام کے خلاف ہے۔ اس کی تدوینِ نو کر کے، اسے اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ یہ

سزا عین اسلام کے مطابق ہے۔ یعنی چند ہی دنوں کے عرصہ میں، ایک ہی عدالت کی طرف سے اسلام کے متعلق دو متضاد فیصلے صادر ہو گئے۔ دیگر کئی ایک قوانین بھی زیرِ ترتیب ہیں جن کے متعلق قسم قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں لیکن چونکہ انہوں نے ہنوز قانونی شکل اختیار نہیں کی اس لیے ان کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

اس تحریک نے کئی نئے نئے فقیہہ، مفتی اور مجدّد پیدا کر دیئے ہیں جن کے پاس اگرچہ قدامت پرست علماء حضرات جتنا علم بھی نہیں لیکن وہ از خود مسندِ افتاء پر بیٹھے، آئے دن اس قسم کے فتاویٰ نافذ کرتے رہتے ہیں کہ فلاں بات بھی اسلام کے خلاف ہے اور فلاں بات بھی۔۔۔ اس کے لیے وہ کسی اتھارٹی کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کا ارشاد ہی کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کے لیے کافی اتھارٹی ہے۔ معیار بالبداہت یہ ہے کہ جو چیز بھی قرآن مجید اور علم و بصیرت کے مطابق ہو، وہ غیر اسلامی ہے۔ عورتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر نظر بند رکھنا چاہئے۔ اگر انہیں کسی اشد ضرورت کے لیے گھر سے باہر نکلنا ہو تو اس طرح لپٹے لپٹائے نکلیں کہ ان کی صرف ایک آنکھ دکھائی دے۔ ان کا کسی ایسی جگہ کام کرنا جہاں مرد بھی موجود ہوں، خلافِ شریعت ہے۔ مردوں اور عورتوں کی مساوات کا تصوّر غیر اسلامی اور مغرب سے مستعار لیا ہوا ہے۔ عورتیں پارلیمان کی ممبر نہیں بن سکتیں۔ انہیں یہاں ووٹ کا حق بھی نہیں دینا چاہئے۔ فوٹو اتروانا خلافِ شریعت ہے۔ (لیکن ٹی وی پر آنا جائز ہے کیونکہ یہ حضرات خود ٹی وی پر آتے اور کثیر معاوضہ پاتے ہیں) چونکہ یہ لوگ (Aesthetic Sense) یعنی فنونِ لطیفہ سے محظوظ ہونے کی حسِ لطیف سے محروم ہوتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک یہ فنون سب ناجائز ہیں۔ حتیٰ کہ قوالی بھی۔ صرف ڈھول اور دف (ڈفلی) کی اجازت ہے۔

یہ ہیں چند مثالیں اس اسلام کی جسے یہ فنڈامینٹل اسٹ رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مقصد اس سے (دو لفظوں میں) یہ کہ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ (61:8) تاکہ جو روشنی خدا نے (اپنی کتاب میں) انسانوں کو عطا کی تھی اسے پھونکیں مار مار کر بجھا دیا جائے۔ سرسیّد کے یہ سب سے بڑے دشمن ہیں۔

اسلام کے سیاسی نظام کے متعلق ہنوز کچھ فیصلہ نہیں ہوا لیکن ابھی سے اس قسم کی آوازیں اُبھرنی شروع ہو گئی ہیں کہ شخصی حکومت ___ ڈکٹیٹر شپ، ملوکیت، حتیٰ کہ موروثی حکومت بھی عین مطابق اسلام ہے اور اس کی سند یہ ہے کہ، صدرِ اوّل کے مختصر سے عرصہ کے بعد، ہمارے ہاں ملوکیت (بلکہ موروثی ملوکیت) متواتر چلی آ رہی ہے۔ آپ نے اس ستم ظریفی پر بھی کبھی غور فرمایا ہے کہ ایک طرف یزیدؔ کے خلاف سب سے بڑا جرم یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے حکومت ورثہ میں حاصل کر کے ملوکیت کی طرح ڈالی تھی اور اس طرح اسلام کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تھی اور دوسری طرف ان تمام مسلمان بادشاہوں کو جنہوں نے اسی طرح مملکت حاصل کی تھی، صحیح اسلامی حکمران ثابت کیا جا رہا ہے اور آج جبکہ زمانے کے تقاضے ہر قسم کی شخصی حکومت کو مٹانے کے درپے ہیں، مسلمانوں میں اس کے احیاء کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اقوامِ مغرب کو مسلمانوں کی شخصی حکومتیں زیادہ (Suit) کرتی ہیں اور دوسری یہ کہ ہمارے ہاں اُنہی قوانین کو اسلامی کہہ کر نافذ کیا جا رہا ہے،

جوان سلاطین کے عہد میں مدوّن ہوئے تھے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان سلاطین کو اسلامی حکمران قرار دیا جائے تا کہ ان کے عہد میں وضع شدہ قوانین کے اسلامی ہونے کی سند ہاتھ آجائے۔ ظاہر ہے کہ فنڈامینٹل ایسٹ سب سے زیادہ مخالفت اس کی کرینگے جو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہو۔ اس لئے کہ قرآن، ہر قسم کی شخصی حکومت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ شخصی حکومت کی ہی نہیں بلکہ مغرب کی سیکولر جمہوریت کی بھی۔ اس لئے کہ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ۔۔۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق ہی حاصل نہیں۔ خواہ وہ ایک فرد ہو اور خواہ افراد کا کوئی گروہ۔ حکومت صرف خدا کی جائز ہے جس کا عملی طریق، اس کی کتاب (قرآن مجید) کی حکمرانی ہے۔ اسی کو ابدی اقدار کی حکمرانی کہا جاتا ہے۔ یہ نکتہ ذرا وضاحت طلب ہے۔ قرآن میں ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ (97:1) ''ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل کیا۔ لیلؔ کے معنی رات کے ہیں لیکن اس سے مراد وہ تاریک دَور بھی ہوسکتا ہے جس کے بعد سحرِ قرآنی کی نمود ہوئی اور دنیا کو روشنی عطا ہوئی۔

مستقل اقدار:

دوسرا لفظ قدر ہے جس کے معنی ہیں پیمانہ یعنی قرآن نے نوعِ انسانی کو حق و باطل کے ماپنے کے صحیح صحیح پیمانے عطا فرمائے۔ انہی کو مستقل اقدار (Permanent Values) کہتے ہیں اور یہی درحقیقت دین اور لادینی۔ کفر اور اسلام، اسلامی نظام اور سیکولرازم میں حدِ امتیاز ہے۔ اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

زندگی جب ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی ہے تو ہر اگلی منزل میں، اپنی پچھلی منزل کے کچھ مضمرات ساتھ لے آتی ہے۔ جب یہ وادیٔ حیوانیت سے منزلِ انسانیت میں داخل ہوئی تو حیوانی زندگی کے کچھ تقاضے اپنے ساتھ لے آئی۔ انہیں جبلی تقاضے یا (Instincts) کہا جاتا ہے۔ ان میں دو تقاضے بڑے اہم ہیں ___ یعنی تحفظِ خویش ___ اور افزائشِ نسل (یعنی جنسی تقاضا)۔ یہ تقاضے حیوانوں اور انسانوں میں مشترک ہیں لیکن ایک بڑے اہم فرق کے ساتھ۔ حیوانات پر فطرت اپنا کنٹرول رکھتی ہے اور انہیں ان کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے۔ سبزی اس کے لئے حرام ہے۔ بکری سبزی کھاتی ہے۔ گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی خواہ بھوکوں کیوں نہ مرجائے۔ یا (مثلاً) ایک بیل کے سامنے کتنا ہی چارہ کیوں نہ رکھا ہو۔ جب اس کا پیٹ بھر جائے گا تو وہ اطمینان سے ایک طرف بیٹھ کر جگالی کرنے لگ جائے گا۔ باقی چارے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھے گا۔ جہاں تک جنسی تقاضا کا تعلق ہے۔ فطرت نے اس پر بڑے محکم (Valve) لگا رکھے ہیں۔ حیوانی نر اور مادہ سارا سال اکٹھے چرتے چگتے رہیں گے۔ ایک دوسرے کی طرف ''نظر بد'' سے دیکھیں گے بھی نہیں۔ لیکن جب اختلاط کا موسم (Mating Season) آئے گا تو پھر، افزائشِ نسل کا فریضہ سرانجام دیں گے اور اس کے بعد، اگلے موسم تک پھر وہی سکوت اور سکون۔ فطرت نے حیوانات کے ان تقاضوں پر اس طرح ویلو لگا رکھے ہیں۔

انسان میں بھی یہ تقاضے موجود ہیں لیکن اسے خدا نے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے اس لئے ان تقاضوں کے پورا کرنے پر، اس پر فطرت کی طرف سے کوئی کنٹرول عائد نہیں کیا گیا۔ اب آپ سوچئے کہ حیوانات کے مقابلے میں انسان کو

لامحدود وسعتیں اور بے پناہ قوتیں دی گئی ہوں، اور اس پر خارج سے کوئی کنٹرول عائد نہ کیا گیا ہو۔ تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ باہمی تصادمات اور تزاحمات کا وہی جہنم جس میں انسان شروع سے جھلستا چلا آرہا ہے اور جس کے شعلے آج فلک گیر ہو رہے ہیں کیونکہ اس کی امکانی وسعتیں حدود فراموش ہو رہی ہیں۔ انسان کا سارا مسئلہ یہ ہے کہ ان تقاضوں کے پورا کرنے پر کنٹرول کونسا اور کس طرح عائد کیا جائے کہ انسان میں باہمی ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔ انسانی فکر نے، سقراط سے لے کر آج تک اس باب میں ہزاروں تراکیب سوچیں اور طریقے وضع کئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کامیاب ثابت نہ ہوا۔ وحیٔ خداوندی نے کہا کہ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے وہی وہ حدود مقرر کرسکتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے ان تقاضوں کو پورا کیا جائے تو کسی قسم کا ٹکراؤ پیدا نہیں ہوسکتا۔ ان حدود کا دوسرا نام اقدار ہے۔ جو قرآن کے اندر آکر مکمل ہوگئی ہیں اور غیر متبدل ہیں۔ انہی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام اسلام ہے اور جس معاشرہ میں یہ اقدار عملاً کارفرما ہوں اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ اقدار، ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ کسی انسان کو، ان میں کسی قسم کا ردو بدل یا حک واضافہ کرنے کا اختیار نہیں۔ یہ اقدار ان حدود کا کام دیتی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی اُمت مسلمہ باہمی مشاورت سے جملہ امورِ مملکت طے کرتی ہے۔ ان۔۔۔ اقدار کے مطابق جو معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں نہ انسانوں کی کسی قسم کی حکومت بار پاسکتی ہے، نہ ہی نظام سرمایہ داری یا مذہبی پیشوائیت، غیر مسلم طاقتیں اس لئے اس نظام کی مخالفت کرتی چلی آرہی ہیں۔ اس کا طریق انہوں نے یہ اختیار کر رکھا ہے کہ چند نظری مسائل اور فقہی احکام کا نام اسلام رکھ دیا جائے اور اُمت کو ان مباحث میں اُلجھا دیا جائے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے ان اقوام کو سب سے زیادہ خطرہ پاکستان سے تھا کیونکہ اسی سرزمین میں سرسیدؒ اور اقبالؒ کی

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآن کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہوسکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہوگیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کردیتے ہیں انہیں تحریکِ طلوع اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لیے سند صرف دو تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

روشن کردہ قرآنی قندیلیں درخشندہ ہیں اور انہیں ڈر ہے کہ یہاں وہ نظام قائم نہ ہوجائے۔ اس لئے فنڈامینٹل ازم کی یلغار کا نمایاں رخ اسی خطہ کی طرف ہے۔ لیکن یہ وقتی اور ہنگامی جھکڑ ہیں جو تیرہ سو سال سے چلتے آرہے ہیں۔ یہ قرآنی شمع کو (خدا نکردہ) گل نہیں کرسکتے، اس لئے کہ خدا کا وعدہ اور اعلان ہے کہ:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳ (9:33)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ راہنمائی اور حق پر مبنی دین (نظام) دے کر بھیجا۔ اس نظام کو دنیا کے ہر نظام پر غالب آکر رہنا ہے۔ خواہ یہ بات ان لوگوں کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے جو خدا کے ساتھ انسانوں کو بھی حقِ حکومت دیتے ہیں۔

جس خدا نے نزولِ قرآن کی ابتداء ''اقدار کی رات'' میں کی تھی اس نے وہیں کہہ دیا تھا کہ اس کی روشنی پھیلے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ سَلٰمٌ ۛ (97:4-5) کائنات کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے سے سلامتی کی آوازیں وجہِ فردوسِ گوش ہوں گی۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵ (97:5) تا آنکہ رات کی تاریکیاں چھٹ کر ساری فضا صبح کی نورانیت سے معمور ہوجائے گی۔ یہ نورانیت سب سے پہلے عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ میں وجہِ تابانی عالم ہوئی تھی جس سے زندگی کے تاریک سے تاریک تر گوشے بھی چمک اٹھے تھے۔ وہ انقلاب ہنگامی طور پر (By Revolution) ظہور میں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ انقلاب ارتقائی طور پر (By Evolution) رونما ہوگا جب انسان اپنے غلط تجارب کے ہلاکت آفریں نتائج سے تنگ آکر، قرآن کے بتائے ہوئے راستے کی طرف آئے گا۔ آپ یہ معلوم کرکے متعجب ہوں گے کہ جن قوموں کے سیاسی اور معاشی تقاضے مسلمانوں کو فنڈامینٹل ازم جیسی تاریکیوں کی طرف لے جانے کی سازشیں کررہے ہیں، انہی اقوام کے اربابِ دانش قرآنی نظام کی تلاش میں مضطرب وسرگرداں ہیں۔ لہٰذا، قرآنی نظام کا قیام تو نوعِ انسان کا مقدر ہے۔ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نور ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی، آخر جلوۂ خورشید سے — یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

ظاہر ہے کہ اس سحر کی نمود اس قوم میں ہوگی جو قرآنی حقائق کو علم وبصیرت کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کرے گی ___ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے، انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال میں لائے گی۔ ان میں پہلی قدر یہ ہے کہ کوئی انسان رات کو بھوکا نہ سوئے اور دوسری قدر یہ کہ کسی انسان کی کسی طور بھی تذلیل نہ ہو۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبیں، ایں است و بس

(مطبوعہ، اگست 1982ء)

جعفر حسین، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بیادِ پرویز

پرویز صاحب کی برسی کے سلسلہ میں ادارہ طلوع اسلام کے زیر اہتمام ایک پروگرام 19 فروری 2017ء کو منعقد ہوا، جس میں جعفر حسین صاحب نے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کچھ اس طرح سے پرویزؔ صاحب کو خراج تحسین پیش کیا:

محترم عاطف طفیل صاحب اور ہمارے آج کے کی نوٹ (Key Note) سپیکر عاطف حسین صاحب، ڈاکٹر صالحہ نغمی صاحبہ اور میرے ہم فکر بہنو اور بھائیو السلام علیکم! عاطف طفیل صاحب نے میرے لیے کافی مشکلات پیدا کر دی ہیں پہلے تو میں نے کچھ منتشر خیالات کا اظہار کرنا تھا انہوں نے صدارتی خطبہ کہہ دیا۔ جب مجھے انہوں نے دعوت دی کہ میں آج کی تقریب کی صدارت کروں میں بہت سوچ میں پڑ گیا۔۔۔ باباجی جیسی شخصیت کے متعلق بات ہو رہی ہو اور میں اس کی صدارت کروں نہ میرا علم اُتنا زیادہ ہے اور نہ میری فکر میں وہ گہرائی ہے کہ میں باباجی کے مقام کا حق ادا کر سکوں کسی بھی طرح سے لیکن ان کے اصرار کی وجہ سے بلکہ مسلسل اصرار کی وجہ سے زیادہ دیر اس کو (Resist) نہیں کر سکا، اس لیے میں یہاں پر بیٹھا ہوں۔ باباجی کا مقام کیا ہے یہ آپ لوگ بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں لیکن جس چیز کو بھی ہم جانتے ہیں اس کا بار بار ذکر کرنا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ ذہنوں میں تازہ بھی ہو جائے۔ ہم جانتے تو بہت کچھ ہیں لیکن عمل صرف انہیں چیزوں پر کر رہے ہوتے ہیں جو ہمارے ذہنوں میں تازہ ہوتی ہیں ہماری فکر کو مسلسل انگیخت دیتی ہیں، اور جہاں پر یہ مسلسل تکرار اور مسلسل اصرار بند ہو جاتا ہے وہاں پر چیزیں ہماری Subconscious میں چلی جاتی ہیں اور ہمارے روزمرہ کی زندگی میں ان کا عمل دخل بہت کم ہو جاتا ہے باباجی کس دور میں پیدا ہوئے اس دور میں ایک طرف تو دیکھتے ہیں کہ مذہب پرست طبقہ جو ہے اس کا بڑا غلبہ ہے اور جس کو مذہب کہتے ہیں وہ مذہب پیدائشی مذہب ہے۔ آج کے دور میں جس مذہب کو ہم سب بڑی Importance دیتے ہیں وہ ہماری پیدائش کے ساتھ ہمیں مل جاتا ہے۔ ہم مسلمان اس لیے ہیں کہ ہم کسی مسلمان کے گھر پیدا ہوئے۔ مسلمانوں میں سے ہم اہل حدیث اس لیے ہیں کہ ہم اہل حدیث کے گھر پیدا ہوئے اور بریلوی اس لیے ہیں کہ بریلوی کے گھر پیدا ہوئے۔ اس مذہب کو ہم اہمیت ہی بہت دیتے ہیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں لیکن ساری زندگی کبھی کھڑے ہو کر یہ نہیں پوچھتے اپنے آپ سے یہ کیا عقائد ہیں؟ جن کی میں پیروی کرتا ہوں، جن کو میں اتنی اہمیت دیتا ہوں اپنی زندگی میں اور جس سے میری جذباتی وابستگی اتنی زیادہ ہے کہ اس کے خلاف کوئی ایک لفظ بولے تو میں نہ صرف یہ کہ اپنی زبان سے اس کا مکمل دفاع کرتا ہوں بلکہ میرے آرگومنٹ ختم ہو جاتے ہیں تو میں اپنی جیب سے پستول نکال کر اس

آرگومنٹ کو ختم کر دیتا ہوں۔ ہم اس درجہ تشدد پر اتر آتے ہیں۔ اتنی Importance ہے اس مذہب کی اور یہ ہمیں مل رہا ہے اسی پیدائش کے اعتبار سے۔ دوسری طرف ایک اور دنیا ہے اس دنیا میں بیالوجسٹ کہتا ہے کہ میں نے سارا انسانی جسم کھنگال مارا مجھے اس میں کہیں Soul نظر نہیں آئی۔ وہاں نیوروسائنٹسٹ کہہ رہے ہیں کہ انسانی دماغ کی ایک ایک Movement کو ہم نے سکین کرنا شروع کر دیا ہمیں اس میں Mind نام کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی یہ تو کچھ کیمیکل آرگونک Movement ہے جس سے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں کبھی فکر پیدا ہو جاتی ہے کبھی آپ کو غصہ آجاتا ہے کبھی آپ ڈپریس ہو جاتے ہیں اس میں Mind نہیں ہے ایولیوشنسٹ کہہ رہا کہ مجھے اس دنیا میں کہیں کوئی Creator نظر نہیں آیا میں نے ملین آف ائیر Million of Years کی اس دنیا کے آرکیالوجیکل سائیٹ کو اگزائمن کیا اور ایولوشن کو سٹڈی کیا مجھے کہیں کوئی Creator نظر نہیں آیا مجھے کچھ نظر آیا کہیں سسٹمیٹک Evolution نظر آیا اور کہیں رینڈم میوٹیشن نظر آیا جس کی وجہ سے ایک کے بعد دوسری مخلوق تخلیق ہوتی چلی گئی اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو کسی پُرمعنی انداز میں دیکھنے کو تیار نہیں ہے کیونکہ اس کو اس زندگی میں معنی نظر نہیں آیا۔ ان باتوں میں ایک لازمی یہ مطلب نکلا کہ ان کے ہاں زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے مرنے کے بعد کی زندگی کا کوئی ایوڈنس Evidence نہیں ہے۔ کوئی objective Evidence ان کو نہیں مل رہا کہ مرنے کے بعد کی زندگی کوئی ہوگی۔ لہٰذا دنیا کیسی ہونی چاہئے؟ دنیا ایسی ہونی چاہیے جیسے انسان کا دل کرتا ہے۔ اس کو کیا کھانا چاہیے جو اس کا دل کرتا ہے۔ اسے کیا ماننا چاہئے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ کیا Values ہونی چاہئیں تو ہمیں Gay Marriage نظر آتی ہیں۔ انسان پستی کے اس درجے پر گر گیا ہے کہ وہ بنیادی طور پر اپنی Survival اور Reproduction کے انتظام سے بھی پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اور یہ ایک چیز ہے جسے سب لوگ کہتے ہیں Evolutionist کہتے ہیں یہ انسان کی سرشت میں ہے کہ اس نے اپنی نسل کو آگے بڑھانا ہے اور اپنی زندگی کو Defend کرنا ہے۔ Survival اور Reproduction۔ یہ دور ہے جی ہمارے دور میں یہ انسانی فکر ہے۔ ایک طرف یہ انسانی فکر ہے جو انسان کو مکمل آزادی دے دیتی ہے وہ اس مذہب کا ایک نام بھی رکھ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ Humanism ہے۔ Humanism میں بھی پھر وہ ایک اور Stage پر جاتے ہیں کہ یہ لبرل ازم ہے جس میں انسان کو مکمل کام کی آزادی ہے، کسی اخلاقی فکر کی پابندی کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کوئی اخلاقی Values نہیں ہیں۔ انسان کی Satistaction اس دنیا کی معراج ہے۔ جنت صرف اس دنیا میں بنے گی ان کے تصور کے مطابق کیونکہ وہ آخرت کی جنت کو ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ اس کا ایک اور بھی نتیجہ یہ نکلا کہ سرمایہ داری نظام جو اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے وہ اپنی بدترین شکل میں ہمارے سامنے اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ خاص طور پر کمیونزم کے ختم ہونے کے بعد جو تھوڑی بہت رکاوٹیں ان کے راستے میں تھیں وہ بھی ختم ہو گئی ہیں۔ آپ کے دور میں ایک بدترین قسم کا سرمایہ دارانہ نظام جس کا ذکر عاطف صاحب نے بھی کیا اور ہمارے آج کے Key Note سپیکر نے بھی کیا کہ دنیا کی ساری دولت چند لوگوں کے ہاتھ میں جمع ہو چکی ہے لیکن

اس کے ساتھ جو لوگ عقل کو انسانی علم کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں اور انسان کو اس دنیا کا خدا بنا کر بیٹھے ہوئے ہیں وہ ایک اور چیز بھی کہتے ہیں کہ انسان کی زیادہ تر چیزیں اس کی پیدائش کے ساتھ متعین ہوتی ہیں یعنی وہ زیادہ تر جو چیزیں سیکھتا ہے وہ اپنے جینز کے ذریعے سیکھتا ہے۔ اس کی شکل صورت تو ہے ہی لیکن اس کی عادتیں اس کے میلانات بھی اس کے جینز کا حصہ ہوتے ہیں۔ جو تھوڑی بہت چیزیں رہ جاتی ہیں وہ ماحول سے سیکھ لیتا ہے اور اس فکر کا لازمی نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ یہ ایک Deterministic Word ہے جس میں انسان کو سوچنے کی اور اپنے اختیار اور ارادے سے ایکٹ کرنے کی کوئی صلاحیت حاصل نہیں ہے۔ سو تین طرح کے نظریات ہیں جو انسان آج Follow کر رہا ہے۔ ایک Humanism ہے جو انسان کو مکمل طور پر صاحبِ اختیار اور ارادہ کو مانتا ہے جو اس کی ہر بات پر صدقِ دل سے یقین رکھتا ہے اور اسے دنیا کا خدا بناتا ہے دوسرا انہی ''سائنس دانوں'' کا ایک اور نظریہ ہے جو وہ سائنس کی رو سے لاتا ہے جس میں وہ انسان کو کسی ارادے اور اختیار کے قابل ہی نہیں سمجھتا۔ بلکہ کہتا ہے اس کی ہر چیز Determine ہو جاتی ہے یا پیدائش کے ساتھ یا اس معاشرے کے اندر جس میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اندر کوئی ایسی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ معاشرے کو تبدیل کر دے۔ معاشرہ شاید کسی Chance پہ یا کسی Random Act کے لحاظ سے تبدیل ہوگا۔

اب تیسرا وہ طبقہ ہے جو کہتا ہے جو کچھ علم دنیا میں آنا تھا وہ آچکا ہے وہ ہمارے بزرگ ہمیں بیان کر گئے ہیں اور ہم نے جو کچھ سیکھنا ہے اس کے لیے ان کے پاس جائیں ان سے پوچھ لیں ان کی کتابیں پڑھ لیں اور بس ہمیں تمام دنیا کا علم حاصل ہو جائے گا اس کے علاوہ دنیا میں سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دنیا ایک گزرگاہ ہے جس میں ہم غلطی سے آ گئے ہیں۔ اور انتظار کرنا چاہئے کہ کسی نہ کسی طرح سے یہ ٹائم پورا ہو۔ مریں اور مرنے کے بعد وہ جنت ملے جو اس دنیا میں اپنے لیے تخلیق نہیں کر سکے۔ اس طبقے کی بات تو ہم چھوڑ ہی دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی جو لوگ سب سے کم تعداد میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور وہ اہل مذاہب تھے جو اس معاشرے میں رہتے تھے۔ کفار تو زیادہ تعداد میں لے آئے لیکن یہودی اور نصاریٰ تھے جن کی تعداد نسبتاً بہت کم تھی کہ وہ اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر کیسے نئے مذہب کو اختیار کرتے یا نئے سسٹم کا پارٹ بنتے۔ سسٹم کا پارٹ تو انہیں بننا ہی پڑا۔ ایک معاشرہ تھا جو انہوں نے تخلیق کیا اس سے باہر وہ نہیں رہ سکتے تھے لیکن وہ اپنے عقائد اور نظریات تبدیل نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ کبھی بھی ایک Active Force نہیں بنے اس معاشرے کی۔ انہوں نے کوئی Active رول Play نہیں کیا لیکن یہ لوگ جو مغرب میں عقل سے کام لے رہے ہیں آج، صرف عقل سے کام لے رہے ہیں وہ آج سوچ کے اس مرکز پر یا معراج پر پہنچتے ہیں جس سے وہ کسی Objective Reality کے بغیر کسی چیز کو ماننے کو تیار ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں خدا ہے ثبوت دیجئے۔ Soul سول ہے انسان جسم کے علاوہ بھی کچھ ہے، آپ اسے Self کہہ لیں وہ Self کو بھی نہیں مانتے۔ وہ Individual کو بھی نہیں مانتے وہ کہتے ہیں Dividual ہے یہ Individual نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دلوں کا حال خدا جانتا ہے۔ وہ مذہب کو Reject کرتے ہیں،

کہتے ہیں تھوڑا سا ٹھہر جایئے دل میں تو کچھ نہیں ہوتا اصل میں تو دماغ ہی ہوتا ہے۔ ہم Brain Net بنانے والے ہیں یہ ایک Project ہے جو وہ Expect کر رہے ہیں کہ 2030ء تک مکمل ہو جائے گا جس میں آپ کے ذہن میں جو کچھ ہے وہ ایک کمپیوٹر Read کر لے گا۔ آپ کے ذہن سے Waves نکلیں گی جو کمپیوٹر Read کرے گا اور وہ One Way Waves نہیں ہوں گی کمپیوٹر سے بھی Waves نکلیں گی جو آپ کے دماغ میں آئیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ A اور B کا دونوں کا، دماغ کمپیوٹر Link ہوں گے A، B کے خیالات پڑھ رہا ہوگا A، B کے خیالات پڑھ رہا ہوگا۔ کسی بائیوگرافی لکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی کسی سائنس دان کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ مرض جاننے کے لیے کسی سائیکالوجسٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دو آدمی Directly اپنے Brains کے ذریعے Communicat کریں گے۔ اس Project پر جو آدمی کام کر رہا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر مجھے پیسے ملتے رہے تو میں 2030ء تک یہ Brain Net، Establish کر لوں گا اور یورپین یونین نے 2014ء میں کوئی ایک بلین Billion یورو دے دیئے ہیں اس کام کے لیے۔ سو جس چیز کو بھی ہم خدا سے منسوب کرتے ہیں وہ اس کو Reject کرتے چلے جاتے ہیں اور Reject کسی علم کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔

مذہب پرست طبقہ کہتا ہے کہ دلوں کا حال صرف خدا جانتا ہے اس لیے ہم کسی کی نیت پر شک نہیں کرتے اس لیے انہیں ہر آدمی آسانی سے بے وقوف بناتا چلا جاتا ہے۔ ہم بننے کو تیار ہیں کیونکہ بے وقوف نہ بننا نیت پر شک کرنا ہوگا۔ دوسری طرف قرآن یہ کہتا ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دو دفع نہیں ڈسا جا سکتا۔ اب مومن کے ساتھ کوئی نہیں چل سکتا لیکن یہ جو Objectivity کے ماننے والے ہیں ان کو ہم کیا جواب دیں کیونکہ آج ہمارا مذہب جو ہے وہ پیدائشی ہے، ہمارے عقائد پیدائشی ہیں، ان پر اس لیے عمل کرتے ہیں کہ ہمیں یہ باپ دادا سے وراثت میں ملے ہیں ہم نے کبھی عقل سے اس پر غور نہیں کیا۔ ہمارے پاس کوئی ریزن نہیں ہے۔ لیکن یہ میں غلط کہہ رہا ہوں کہ ہمارے پاس کوئی ریزن نہیں ہے ہمارے پاس ایک ایسی چیز ہے جس کو ہم Objectively ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ کسی انسان کی لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے Objectively ثابت کر سکتے ہیں۔ یہ صرف کسی عقیدہ کی بات نہیں ہے قرآن کریم کو ہم انسان کی تحریر نہیں سمجھتے اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھتے ہیں اور انہیں الفاظ میں ان کی حفاظت کو مانتے ہیں جن الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اس کو وحی کے ذریعے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب، دل پر نازل کیا۔ یہ محض اب عقیدہ کی بات نہیں رہ گئی اس کو آج Objectively ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب 14 سو سال پہلے کسی انسان نے نہیں لکھی تھی۔ آج کے انسان کو جو عقل سے کام لے رہا ہے اس کو یہ بات سمجھانی اتنی مشکل نہیں ہے۔ لیکن اس کتاب کی جو تشریح ہم نے کی اور جس تشریح کو آج ہم ماننے پر اصرار کرتے ہیں وہ تشریح 13 سو سال پرانی ہے یا 12 سو سال پرانی ہے۔ یہ اس زمانے کے انسانی ذہن کی تشریح ہے جس کا علمی لیول 12 سو سال پرانا ہے۔ آج کا انسان 12 سو سال پرانے تمام علم کو Reject کر چکا ہے۔

وہ ان باتوں کو ماننے کو تیار ہی نہیں ہے جو 12 سو سال پہلے کی ہیں۔ غلام احمد پرویزؔ بابا جی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب کی وہ تشریح کی جو آج کے ایسے انسان کو جو عقل سے کام لینے کو تیار ہے، جو نئی چیزیں قبول کرنے کو تیار ہے، اس کے ذہن کو اپیل کرتی ہیں۔ یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ایسے شخص کا جو ایک ایسے گھر میں پیدا ہوا جو اسی طرح مذہبی تھا جیسے کہ آج کے دور کے سب ہیں یہ اسی پرانے مذہب پر یقین رکھتا تھا اور اس تصوف کے اندر ڈوبا ہوا تھا جس تصوف کی وجہ سے فکر منجمد ہو جاتی ہے اور انسان سپر پچویلٹی میں ایسا گرفتار ہوتا ہے کہ وہ اپنے حال سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو آج کے ہمارے Key Note سپیکر کے الفاظ میں کہوں گا کہ بلیک سوان ثابت ہوا ہے ان کے بلیک سوان شاید اقبال تھے۔ ان کی اقبال سے ملاقات ہوئی اور اس ملاقات میں اقبال نے ان کی سوچ کو بدل دیا۔ بابا جی پہلی دفعہ اقبال سے ملے تو بہت متاثر ہوئے اقبال سے۔ اس کے بعد مسلسل اقبال سے ملنا جاری رہا۔ ایک ملاقات میں اقبال نے ان کو کہا کہ سنا ہے کا کا تم بھی شاعری کرتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ نہیں جی میں شاعری کرتا تھا کہنے لگے پھر کیا ہوا۔ کہنے لگے اور میں نے اقبال کو پڑھ لیا پھر میں نے اپنی شاعری جلا دی۔ پھر اقبال نے ایک Sentence کہا کہ جس دن تم قرآن پڑھ لو گے اس دن اقبال کی شاعری بھی جلا دو گے۔

ایک درس میں بابا جی نے کہا کہ یہ جملہ میرے دماغ میں گھومتا رہا، مہینوں تک گھومتا رہا کیونکہ میں تو قرآن روز پڑھتا تھا۔ مجھے تو قرآن بیشتر از بر یاد تھا۔ یہ اقبال نے کیا کہہ دیا کہ جس دن تم قرآن پڑھ لو گے۔۔۔ کئی مہینوں تک اس بات کو اپنے ذہن میں گھمانے کے بعد ایک دن اقبال کے پاس ہی گئے کہ یہ جملہ مجھے سمجھ نہیں آیا اور اقبال نے کہا اور سمجھا یا قرآن پڑھنا کیا ہوتا ہے اور کس طرح سے اسے پڑھنا چاہئے اور اس کے بعد زندگی کا ایک سفر ہے جو اتنا طویل سفر ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگ جب پہلے دن ان کو بتایا جائے کہ یہ سفر اتنا طویل ہوگا شاید ہم پہلا قدم بھی اٹھانے کو تیار نہ ہوں۔ ایک زندگی گزر گئی اس طویل سفر میں، کیا کیا نہیں پڑھا اور کیا کیا نہیں لکھا اس سفر میں۔ پورے پورے ادارے بھی اتنی کتابیں نہیں لکھ سکتے جتنی اس ایک شخص نے تن تنہا لکھیں۔ ان کتابوں کو ہاتھ سے لکھا، کوئی کمپیوٹر نہیں تھا۔ ان کی کتابت کروائی، ان کی پروف ریڈنگ بھی خود ہی کی، پروف ریڈنگ کرواتے اور اس کے بعد ساری پروف ریڈنگ خود دوبارہ کرتے، اس سارے عرصے میں صرف کتابیں ہی نہیں لکھ رہے تھے، نت نئے علوم جو اس دنیا میں چلے آ رہے تھے ان کا مطالعہ بھی کرتے جا رہے تھے۔ اس سارے عرصے میں ہر اتوار یا ہر جمعہ کو لوگ یہاں جمع ہوتے، گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹے کا ایک درس بھی ہوتا، اس تمام عرصے میں ایک رسالہ نکالتے رہے جس میں بیشتر چیزیں اپنے ہاتھ سے لکھا کرتے تھے مضامین جو بہت ہی عمدہ ہوتے، وہ سب خود انہوں نے لکھے جو اس رسالے میں چھپتے اور جو اس وقت تبصرے کتابوں پر ہوتے وہ بھی خود ہی لکھا کرتے۔ اس دوران مسلسل کنونشن کرواتے اور کنونشن پر دو یا تین بہت ہی پر مغز مقالے پڑھا کرتے تھے۔ اس سب کے ساتھ ایک خاندان کی کفالت بھی کرتے یعنی کوئی دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ اور آج جو ہم ان کے کتابوں کے ذخیرہ کو دیکھتے ہیں تو ان کو پڑھنے کے لئے کئی کئی سال گزر جاتے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیں کہ لکھنے میں کتنا عرصہ لگا ہوگا۔ پھر ایسا نہیں تھا کہ جامد فکر تھی، اپنی ہی کہی ہوئی کئی باتوں کو

Reconsider اور اقرار کرتے کہ پہلے میں شائد اس کو غلط سمجھا تھا اور دوبارہ میں نے یہ غور کیا تو اس کا یہ مطلب میری سمجھ میں آیا یعنی حریت فکر اتنی تھی کہ اپنی غلطی کو تسلیم کرنے میں کوئی بات ہی نہ تھی۔ کیونکہ انہوں نے ساری زندگی کبھی یہ نہیں کہا کہ میں قرآن کا ایک سکالر ہوں ہمیشہ یہ کہا کہ میں قرآن کا ایک طالبعلم ہوں آپ کو مجھ سے اختلاف کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ آپ بالکل اختلاف کر سکتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میری فکر غلط ہے اور میں آپ کے اس کہنے پر ناراض نہیں ہوں گا۔ میں اس کو Reconsider کروں گا اور لوگ کہتے بھی تھے کئی چیزوں پر آکر اعتراض بھی کرتے، وہ سنتے ان کی بات اور علمی دلائل سے ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے لیکن کبھی انہوں نے غصے میں کسی کے ساتھ بات نہیں کی۔ میرا تعلق میرے خاندان کا تعلق بابا جی سے اُتنا ہی پرانا ہے جتنی میری عمر ہے۔ میں 1961ء میں پیدا ہوا اور وہی سال تھا جب میرے والد صاحب مختلف سکالرز اور مختلف مذہبی شخصیات سے فیض لیتے لیتے کسی دوست کے حوالے سے یہاں پہنچے۔ ان کا یہ سفر 1948ء میں شروع ہوا تھا اور 1961ء میں جب سفر کی اس منزل پہ پہنچے تو اس کے بعد سے کوئی اور منزل ان کو نہ ملی اور کہیں جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بابا جی سے ہمارے مراسم جو ہیں صرف علمی نہیں تھے بلکہ خاندانی بھی تھے۔ میں بہت چھوٹا تھا تب میں اپنے والد کے ساتھ آیا کرتا تھا یہاں پر اور بابا جی کا درس سنتا تھا۔ اس زمانے میں بالکل سمجھ نہیں آتا تھا۔ جس علمی سطح پر وہ بات کر رہے ہوتے تھے وہ میرے جیسے میٹرک کلاس کے طالبعلم کی سمجھ سے بالاتر تھیں بعد میں مَیں نے کچھ کتابیں ان کی پڑھیں اور وہ کتابیں پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ کتنی بڑی شخصیت تھے۔ اس کے بعد میں نے ان کے سارے دروس جب سے ان کی ریکارڈنگ موجود تھی وہ سارے میں نے سنے اور میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میری زندگی میں بابا جی کے خیالات کا کتنا بڑا اثر ہے۔ میں شاید کبھی اتنی بے باکی سے اتنا سوچ نہ سکتا، کبھی میری فکر میں یہ چیز نہ پیدا ہوتی کہ میں Existing Dogmas کو چیلنج کروں اور اپنے بچوں کو اس بات کی آزادی دوں کہ بھائی آپ نے اس لیے مسلمان نہیں ہونا کہ آپ کا باپ مسلمان ہے۔ یہ میں نے آزادی دے رکھی ہے اپنے بچوں کو کہ آپ سوچ سمجھ کر مسلمان ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم جو ہے وہ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ ہَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـُٔوۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ (2:62) یہ نہیں کہ اپنے باپ کے عقیدہ کی پابندی اس لیے کرتے رہنا کہ تمہارا باپ ہے۔ بابا جی کی فکر سے متاثر ہونے کے بعد یا اسے قبول کرنے کے بعد اگر کوئی شخص ترقی نہیں کرتا اگر اس کی فکر آگے نہیں بڑھتی تو اس کو یہ سوچنا چاہئے کہ آیا اس نے اس فکر کو ٹھیک طرح سمجھا ورنہ فکر اتنی Vibrant ہے کہ یہ آپ کو ہمیشہ کئی قدم آگے لے جائے گی فکرِ پرویز کو سمجھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غلام احمد پرویزؒ نے قرآن کی کیا تشریح کی وہ قرآن کی تشریح ہے وہ فکرِ پرویز نہیں ہے وہ قرآن کی تشریح قرآن ہی سے ہے۔ پرویزؒ نے اپنی فکر کی آمیزش نہیں کی ہے۔ اس نے قرآن کو خالص ہی رہنے دیا ہے۔

فکرِ پرویزؒ کو سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر دور کا انسان اس قرآن پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کرے اور اپنے

زمانے کے مسائل کے حل کے لیے اس قرآن سے رہنمائی لے۔ وہ پرانے دور میں دی گئی رہنمائی کو اپنے لیے آخری سند نہ سمجھ لے اور اس رہنمائی کی بنیاد پر آج مسائل حل کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ آج کے درس میں بھی آ کر میں وہ یہ ہی کہہ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود و قیود مقرر کر دی ہیں۔ اس کے اندر رہتے ہوئے آپ کو مکمل آزادی دی ہے سوچنے کی اور آپ سے توقع یہ رکھی ہے کہ آپ اپنے مسائل کے لیے خود غور کریں گے اور خود فیصلے کریں گے۔ ان حدود سے باہر نہیں جائیں گے۔ لیکن آپ کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے مکمل آزادی ہے۔ حدود اللہ مقرر ہے Permanent Values بھی مقرر ہیں لیکن ہر دوسرے انسان کے مسائل مختلف ہوں گے اور ہر دور میں اس کا حل بھی مختلف ہوگا۔ فکرِ پرویزؒ ہمیں اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ ہم اپنے دور کے مطابق اس قرآن پر غور کریں اور اپنے دور کے علوم کے مطابق۔ تین باتیں کہا کرتے تھے:

قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے وہ کہتے تھے کہ آپ کو محاورۂ عرب آنا چاہئے، آپ زمانے کے علم سے واقف ہوں اور آپ تصریفِ آیات کے ذریعے اس قرآن کو سمجھیں۔ لغت بھی مرتب کر گئے۔ تصریفِ آیات بھی انہوں نے اچھی طرح سمجھا دیں لیکن انہوں نے قرآن کا ترجمہ نہیں کیا۔ انہوں نے قرآن کا مفہوم لکھا۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس قرآنِ کریم کا ترجمہ ممکن نہیں اور مفہوم بیان کرتے ہوئے انہوں نے زمانے کا علم جس سطح پر تھا اس سے مکمل اکتساب کیا اور اس کی روشنی میں قرآنِ کریم کا مفہوم مرتب کیا۔ فکرِ پرویز سے وابستگی کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کے لیے ہم تیار ہیں کہ ہم اپنے دور کے مطابق، اپنے دور کے مسائل کے مطابق آج کے لیے راستہ تراشیں گے، آج کے لیے وہ حل تلاش کریں گے۔ اگر ہم اس سے متفق ہیں تو ہمیں بہت جلد سب کو مل کر کوئی ادارہ ایسا بنانا چاہئے جو فکرِ پرویز کی روشنی میں قرآن مجید پر غور و فکر کرنے کا سلسلہ جاری رکھے اور آج کے دور میں جو مسائل درپیش ہیں ان کے ایسے حل بتائے جائیں جو آج کے انسان کے لیے Acceptable ہوں۔ مثلاً ہمارے معاشی نظام کے بارے میں ہم کہتے ہیں سود نہیں ہونا چاہئے بالکل نہیں ہونا چاہئے ہم سب متفق ہیں اس سے گو کہ سود کے معنی پہ ہمیں دوبارہ غور کر لینا چاہئے کہ سود کا مطلب کیا ہے۔ بہرحال اس پر اتفاق ہے لیکن پھر کیا ہونا چاہئے ''لا'' تو ٹھیک ہے مگر اس کے بعد ''الا اللہ'' بھی بتائیے نہ کہ کون ہے۔ میں ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں آپ سب صاحبان کا کہ آپ نے بڑے صبر کے ساتھ میرے منتشر خیالات کو سنا اور میں ادارہ کا، اور بزم لاہور کے رُکن عاطف طفیل صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے دعوت دی اور مجھے آج اس بڑی کرسی پہ بٹھایا۔ کرسی اس لیے بھاری تھی کہ یہاں بیٹھ کر پرویز صاحب کی بات کرنی تھی اس لیے میں سمجھتا ہوں مجھ سے بہت زیادہ Qualified لوگ ابھی بھی موجود ہیں جو پرویز صاحب کے بارے میں بابا جی کے بارے میں اور زیادہ بہتر باتیں آپ سے کر سکتے ہیں۔ بہت شکریہ

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آزادی کا قرآنی مفہوم

غیر منقسم ہندوستان میں، کانگریسی (یعنی ہندو) بار بار (تحریکِ پاکستان کے سربراہ) قائداعظمؒ سے کہتے تھے کہ جب ہمارا مقصد بھی حصولِ آزادی ہے اور آپ کا مقصد بھی وہی، تو آپ کو ایک الگ تنظیم قائم کرنے اور جداگانہ تحریک چلانے کی ضرورت کیا ہے؟ آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جایئے۔ ہم دونوں مل کر، انگریز کو یہاں سے نکال کر آزادی حاصل کر لیں گے اور نظامِ جمہوریت کی رُو سے عوام کی حکومت قائم کریں گے جس میں تمام باشندگانِ ملک کو یکساں آزادی حاصل ہوگی۔ اس کے جواب میں (پہلے علامہ اقبالؒ اور ان کے بعد) قائداعظمؒ ان سے کہتے تھے کہ لفظی طور پر تو آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن جہاں تک لفظ آزادی کے مفہوم کا تعلق ہے، وہ آپ کے اور ہمارے نزدیک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ انگریز یہاں سے چلا جائے اور اہلِ ہند اپنی حکومت آپ قائم کر لیں لیکن ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم و مقصود اس سے مختلف ہے اور وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت قائم نہ ہو جائے۔ (بالفاظ دیگر) وہ ان سے کہتے تھے کہ تمہارے نزدیک ''آزاد مملکت'' کا قیام مقصود بالذات ہے اور ہمارے نزدیک، آزاد مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جو مسلمان کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔

یہ تھا تحریک پاکستان کے دوران کانگریس اور مسلم لیگ، یا ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی کشمکش کا نقطۂ تصادم، مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا مفہوم کیا ہے، اس کی وضاحت کے لیے وہاں طلوعِ اسلام کا وجود عمل میں آیا۔ اس نے اس فریضہ کو کس حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ ادا کیا، اس پر اس کے اُس زمانے کے فائل شاہد ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد (نظر بظاہر) اس کشمکش کو ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن (یہ فطرت کی ستم ظریفی یا ہماری انتہائی بدنصیبی تھی کہ) یہاں پہنچنے کے بعد یہ کشمکش اور بھی شدت اختیار کر گئی۔ یعنی یہاں آزادی سے وہی مفہوم لے لیا گیا جسے تحریکِ پاکستان کے دوران ہندو پیش کرتا تھا۔ یعنی مسلمانوں کی آزاد مملکت میں جمہوری نظام کا قیام، فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں آئین کے برسرِ نامہ خدا اور اسلام کے الفاظ چسپاں کرا دیئے گئے، اسی طرح جس طرح ہم اپنے خطوط کی پیشانی پر بسم اللہ یا (786) لکھ دیتے ہیں، خواہ اس کے نیچے خط میں شراب کی درآمد برآمد کی ہدایات ہی کیوں نہ درج ہوں۔

لہٰذا یہاں بھی طلوعِ اسلام نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لیا کہ وہ بتائے کہ آزادی کا وہ مفہوم کیا تھا جس کے لیے اس خطۂ زمین

کو حاصل کیا گیا تھا۔ یوں تو طلوعِ اسلام کی کون سی اشاعت ہے جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اس موضوع پر کچھ نہ کچھ نہ لکھا جاتا ہو، لیکن خاص تقاریب بالخصوص یومِ آزادی 14 اگست کی تقریب پر اس میں پرویز صاحب کے خصوصی مقالات یا خطابات اشاعت پذیر ہوتے ہیں۔ یومِ آزادی کی تقریب کے سلسلہ میں جب ہم نے گذشتہ تقاریب کے خطابات پر ایک نظر ڈالی تو ہم نے دیکھا کہ انہوں نے، 1973ء میں جو خطاب ارزانی فرمایا تھا (اور جس کا عنوان تھا ــــ ''کیا ہم آزاد ہیں؟'') وہ نہ صرف بڑا جامع اور مانع تھا بلکہ ایسا کہ وہ ملک کے موجودہ حالات میں بھی شمع قرآنی کا کام دے سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس تقریب پر، ان کے نظر ثانی شدہ خطاب کو زیب دہ اوراقِ طلوع اسلام کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ پرویزؔ صاحب اپنے خطابات یا مقالات میں جو قرآنی حقائق پیش کرتے ہیں وہ کبھی پُرانے یا (Out of Date) نہیں ہوتے۔ البتہ ان کی تشریحات اور جزئیات، حالات کے بدلنے سے محتاجِ تغیر و تبدل ہو جاتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد، ان کا خطاب ملاحظہ فرمائیے۔

عزیزانِ گرامی قدر، سلام و رحمت!

اگست 1948ء میں جب ہم نے اپنی آزادی کی پہلی سالگرہ منائی تو اس موضوع پر جو کچھ طلوعِ اسلام میں لکھا گیا تھا وہ آج بھی ہر سوچنے والے ذہن کو اسی طرح دعوتِ غور و فکر دیتا ہے اس میں کہا گیا تھا کہ:

''انسانی تاریخ کے اوراق پیچھے کو الٹتے جائیے۔ کاغذ سے دھاتوں اور دھاتوں سے پتھروں، محلات سے جھونپڑیوں اور جھونپڑیوں سے غاروں تک کے ازمنہ مظلمہ میں پہنچ جائیے۔ اس کی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے خاکے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی، خیالات بدلیں گے۔ طرز بود و ماند بدلے گا۔ اسلوب رفتار و گفتار بدلے گا۔ لیکن اعصار و دہور کے اس تضاد و تباین، اور اعصار و دیار کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی حمد و ستائش میں لاہوتی نغمے گائے ہیں۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوجا ہے۔ لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور بلا تخصیصِ زمان و مکان، ہمیشہ شردھا کے پھول چڑھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا تک کے منکرین مل جائیں گے لیکن کسی دور میں ایسا گروہ نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جدوجہد کی مسلسل داستان۔ مختلف ادوار میں نمارید و فراعنہ زمان اور اکاسرہ و قیاصرۂ دہر ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ کمزور اور ناتواں انسانوں کے سینے سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے لیکن کمزور و ناتواں انسانوں نے اپنا سب کچھ لٹنا اور مٹنا گوارا کر لیا مگر آزادی کی حسین آرزوؤں کو اپنے دل کے کاشانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ انہوں نے اس قربان گاہ پر اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک کی بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حرف

نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگِ ساحل پر اَن گنت موجیں آئیں اور مختلف نقوش کو بہا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔ لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی مسلسل تگ وتاز کے باوجود کبھی مٹ نہ سکا تو وہ اس بطلِ جلیل کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی۔ یا پھر اس ننگِ انسانیت کا نام جس نے اپنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ بہرحال، دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانوں سے ماپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے، بایں نمط کہ آزادی کا لفظ دنیا کے ہر لغت میں شرف ومجدِ انسانیت کے مرادف اور غلامی، ذلت وخواری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

جو کچھ اُوپر کہا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود کیا یہ امر باعثِ صد تعجب وموجب ہزار حیرت نہیں کہ آزادی کی خاطر سب کچھ کر گزرنے والا انسان آج تک یہ بھی متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کہتے کسے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑیئے۔ اس بات میں خواص تک کی یہ کیفیت ہے کہ وہ آزادی کی کوئی متعین (Definition) بھی نہیں دے سکے۔ میرے سامنے اس وقت پولیٹیکل سائنس کی ایک کتاب ہے جو نہایت مختصر ہونے کے باوجود خاصی شہرت کی حامل ہے یعنی (Social Justice)، اس میں عصرِ حاضر کے ممتاز مفکرین کی طرف سے پیش کردہ آزادی کی (Definition) درج کی گئی ہیں اور اس کے بعد بدلائل وشواہد بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی ڈیفی نیشن بھی جامع اور واضح نہیں۔ ان تمام فکری اختلافات کے باوجود ایک بات البتہ ہر جگہ اور ہر مقام میں بطور قدرِ مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی قوم پر کوئی دوسری قوم حکمران ہو تو اُسے غلامی کہا جاتا ہے اور اپنی حکومت کو آزادی۔ چنانچہ ہندوستان میں تحریکِ آزادی سے بھی یہی مفہوم لیا گیا تھا۔ وہ تحریک، سامراج (یعنی غیروں کی حکومت) کے مقابلہ میں سوراجیہ (اپنی حکومت) کے لیے جہد وجہد تھی۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی:

ضمناً (مہاتما) گاندھی نے، مسلمانوں میں رائج اصطلاح ___ حکومتِ خداوندی ___ کے مقابلہ میں رام راجیہ اصطلاح وضع کی تھی لیکن وہ چل نہیں سکی تھی۔ وہاں آزادی کے لئے سوراج ہی کی اصطلاح رائج رہی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ایک غیر قوم، یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر، ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔ یہی تحریکِ آزادی کا منتہیٰ ومقصود تھا۔ اس جدوجہد میں، ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور مذہبی راہنما، مثل مولانا ابوالکلام آزادؔ، مولانا حسینؔ احمد مدنی وغیرہ شامل تھے اور اس جدوجہد کو جہاد قرار دیتے تھے۔ یہ جدوجہد ایسی تھی جس کے مقصد ومنتہیٰ (یعنی غیروں کی جگہ اپنی قوم کی حکومت کے قیام) کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب یہ جدوجہد پورے زوروں پر تھی تو اس کے خلاف ایک آواز بلند ہوئی جس نے نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ آزادی کا یہ مفہوم ہندو کے نزدیک صحیح ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا یہ مفہوم ومقصود درست قرار نہیں پا سکتا۔ ان کے نزدیک، از روئے اسلام آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ تحریکِ آزادی کے علمبرداروں نے اس آواز کی سخت مخالفت کی اور اس میں چونکہ یہ کہا گیا تھا کہ اسلام کی رُو سے آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے اس لئے اس آواز کی مخالفت میں علماء حضرات

بڑی شدومد سے آگے بڑھے۔ انہوں نے مشہور یہ کیا کہ یہ آواز انگریز کے وضع کردہ ناقوس کی صدائے بازگشت ہے اور مقصد اس سے آزادی کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکانا۔

علامہ اقبالؒ کی آواز:

اس آواز کے بلند کرنے والے نے کہا کہ یہ الزام سراسر کذب ہے، افترا ہے۔ جہاں تک انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا تعلق ہے، مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ لیکن جہاں انگریزوں کا یہاں سے نکل جانا، ہندوؤں کے نزدیک مقصود و منتہیٰ ہے، مسلمانوں کے نزدیک یہ اس جدوجہد کا منتہیٰ نہیں قرار پاسکتا۔ یہ ان کے پیشِ نظر مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ یا سنگِ میل قرار پاسکتا ہے۔ یہ آواز تھی حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی جنہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اپنے مفہوم کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی کہ:

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہوسکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیۃً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بدتر بن جائے، تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا بولنا، روپیہ صَرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

جمہوریت:

اس کے جواب میں کہا گیا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد، ہندوستان میں جمہوری نظام نافذ کیا جائے گا۔ جسے نہ صرف یہ کہ اس وقت دُنیا کا بہترین نظامِ سیاست تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ وہ عین مطابق اسلام ہے۔ اس لئے اقبالؒ کا اعتراض، اس کی قدامت پرستی، تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہے۔ اقبالؒ نے کہا کہ جس نظام کو تم بہترین نظام کہتے ہو، آزادی کے عام تصور کی رُو سے بھی اس کی حقیقت یہ ہے کہ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو اِستبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور جہاں تک اس کے اسلامی ہونے کا تعلق ہے، سُن رکھو کہ ؎

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لہٰذا، اسلامی نقطۂ نگاہ سے مغرب کا جمہوری نظام ویسا ہی مردود و مطرود ہے جیسا نظامِ ملوکیت۔ اس نظام کے تحت آزادی کو ہم آزادی کہہ ہی نہیں سکتے لہٰذا، ہندو کی تحریکِ آزادی کے خلاف، مسلمان اسی طرح نبرد آزما رہیں گے جس طرح انگریز کی غلامی کے خلاف محاذ آراء ہیں۔ اس کے بعد جب تحریکِ آزادی کی زمامِ قیادت، قائداعظمؒ نے اپنے ہاتھ میں لی تو وہ بھی مسلسل اور متواتر اقبالؒ کی پیش کردہ حقیقت کو دہراتے رہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ ''ہم ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے، بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی، اپنے ثقافتی نشوونما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔''

(تقاریر محمد علی جناح، جلد دوم، ص:333، ص:346)

یہ تھا آزادی کے مفہوم کے متعلق ہمارا اختلاف جس کی بناء پر ہم نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف محاذ قائم کیا تھا۔ ہماری یہ محاذ آرائی اس وقت تک جاری رہی جب تک ہم نے پاکستان حاصل نہ کرلیا۔

ہم نے آزادی کے اپنے منفرد مفہوم کے لیے پاکستان حاصل کرلیا لیکن اس کے بعد دنیا نے ایک عجیب تماشہ دیکھا کہ یہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کے اس جمہوری نظام کو رائج کرلیا جسے اقبالؒ نے اسلام کے خلاف سازش قرار دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے دو باتیں کہی تھیں۔ ایک یہ کہ مغرب کا جمہوری نظام، استبداد ملوکیت ہی کی ایک نقاب پوش شکل ہے۔ اس میں نوع انسان کبھی آزادی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی اور دوسرے یہ کہ یہ نظام، اسلام کی ضد ہے۔ اس لیے اس میں مسلمان کو وہ آزادی میسر نہیں آسکتی جو اسے اسلام عطا کرنا چاہتا ہے۔ میں آج کی نشست میں اقبالؒ کے ان ہر دو عاوی کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا اپنی آزاد مملکت کے حصول کے بعد، مغرب کے جمہوری نظام میں ہمیں حقیقی آزادی نصیب ہوگئی ہے، اور دوسرے یہ کہ اس نظام کے متعلق خود مغرب کے اربابِ فکر و دانش اب کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

جمہوری نظام کے اساسی اصول:

مغرب کے جمہوری نظام (ڈیما کریسی) کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:

1۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں اور ان کے اس اقتدار پر کسی اور کا کنٹرول نہیں۔ عوام کو اقتدارِ مطلق حاصل ہے۔ (Demo-Cracy) کے معنی ہی عوام کی حکومت ہیں۔

2۔ اس نظام میں عوام اپنے حاکم آپ ہوتے ہیں اس لیے حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس میں یہ تفریق ہی

مٹ جاتی ہے۔

3۔عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں۔

4۔ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے، یعنی وہ آئین یا قوانین جنہیں وہ وضع کر دیں، حرفِ آخر ہوتے ہیں جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ نمائندے اپنے فیصلوں کو جب بھی چاہیں خود بدل سکتے ہیں۔

5۔عوام کے یہ نمائندے دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ جو گروہ اکثریت میں ہوتا ہے وہ سیاہ وسفید کا مالک ہوتا ہے۔ جو اقلیت میں رہ جاتا ہے اس کا مسلک اکثریت کی مخالفت کرنا اور ایسے حالات پیدا کرنا ہوتا ہے جن کی رو سے ان کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے اور اس طرح اقتدار ان سے چھن کر ان کے ہاتھ میں آ جائے۔

6۔برسرِ اقتدار (اکثریتی) پارٹی جو کچھ جی میں آئے کرے۔ اسے اس مدّت سے پہلے جس کے لیے عوام نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، خود عوام بھی برطرف نہیں کر سکتے بجز اس کے کہ وہ نمائندے اکثریت میں نہ رہیں۔

مغرب کے اربابِ فکر ونظر اس نظام کے عملی تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جن کا یا تو وجود ہی کوئی نہیں اور یا، جو یکسر باطل ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان اربابِ علم ودانش کے نتائج فکر کو سامنے لائیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مغرب نے اس نظام کو وضع اور اختیار کن حالات میں کیا تھا۔

یورپ کا انقلاب:

اقوامِ یورپ استبداد کی چکی کے دو پاٹوں میں بُری طرح پس رہی تھیں۔ یعنی ملوکیت کی قہرمانی اور اربابِ کلیسا کی تھیاکریسی ___ تھیاکریسی کا نظریہ سینٹ پال کا وضع کردہ ہے جس نے کہا تھا کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے لیکن اس نے اپنا یہ حق کلیسا (پادریوں) کو تفویض کر دیا ہے اب یہ خدا کے نام پر جو جی میں آئے کریں۔ جب کلیسا اور رومن شہنشاہیت کا گٹھ جوڑ ہوا تو یہی اختیارات خداوندی شہنشاہوں کی طرف منتقل ہو گئے لیکن ان پر کنٹرول کلیسا ہی کا رہا۔ لوتھر نے اپنی اصلاحی تحریک سے کلیسا کے فولادی شکنجے کو یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ انجیل کے سمجھنے کا حق ہر فرد کو حاصل ہے نہ کہ صرف چرچ کو۔ لیکن اس سے نظامِ حکومت کا مسئلہ حل نہ ہوسکا کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون ہی نہیں دیا گیا۔ لہٰذا حکومت کا استبداد بدستور قائم رہا۔ اس صورتِ حالات سے تنگ آ کر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس کا نتیجہ روسو کا نظریۂ حکومت تھا۔ اس نظریہ کی رو سے کہا یہ گیا کہ حق اقتدار نہ بادشاہوں کو حاصل ہے نہ کلیسا کے خدائی نمائندوں کو۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ یوں نظامِ جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آیا اگرچہ اس کا اساسی تصور مفکرینِ یونان نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ ملوکیت اور کلیسا کے استبداد کی چکی میں پسنے والی انسانیت نے اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر نہایت جوش وخروش اور مسرت وانبساط سے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے نوعِ انسان کے لیے آیۂ رحمت سمجھا۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نظریہ جمہوریت (ڈیماکریسی) کے سامنے آنے پر یہ جوش ومسرت، درحقیقت استبدادِ ملوکیت اور قہرمانیٔ مذہبی پیشوائیت

سے حصولِ نجات پر منفیانہ ردعمل تھا۔ نظامِ جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہارِ تشکر نہیں تھا۔ اس نظام پر تو ابھی تجربہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے عملی تجربہ کے بعد مفکرینِ مغرب جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس ضمن میں میں اپنی کتاب ''انسان نے کیا سوچا'' کے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ مزید تصریحات اب پیشِ خدمت ہیں۔ مفکرین مغرب کے عملی تجربہ کا ملخص کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (Ewing) کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

> اگر روسو، عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا (تمام حوالے خطاب کے آخر میں ملیں گے۔)

1۔ اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی گئی تھی کہ اس میں لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں اور اس طرح حاکم اور محکوم کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن فرانسیسی مفکر رینی گوئن اس باب میں لکھتا ہے کہ:

> اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہوگا جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی تھی اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ اس میں جو لوگ برسرِ اقتدار آجاتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ قائم کر دیں۔ کہ ان پر کوئی حاکم نہیں وہ اپنے حاکم آپ ہیں یعنی حکومت عوام کی ہے۔

2۔ شکاگو یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (Alan Gewirth) حقیقت کی نقاب کشائی ان الفاظ میں کرتا ہے:

> اس نظام میں پبلک یا قوم کے الفاظ ایک افسانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس میں درحقیقت محض مؤثر پارٹیاں اپنا وجود رکھتی ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو نظریۂ جمہوریت جوشِ خطابت کا پیدا کردہ افترا ہوتا ہے جس میں صداقت، نیکی اور حسنِ عمل کے الفاظ کے حربے ہوتے ہیں جن کے ساتھ یہ گروہ میدانِ کارزار یا مارکٹ میں سامنے آتے رہتے ہیں۔

3۔ اس نظریہ کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ اس میں حکومت، عوام کی رضامندی سے قائم ہوتی ہے اور جو حکومت کسی کی رضامندی سے قائم ہو اس کی فرماں پذیری اس پر لازم آجاتی ہے۔ لہٰذا جمہوری نظام میں برسرِ اقتدار گروہ کی حکمرانی استبداد نہیں ہوتا، عوام کی بطیب خاطر رضامندی پر مبنی نظامِ اطاعت ہوتا ہے۔ پروفیسر (Gewirth) اس باب میں لکھتا ہے کہ:

> ''(یہ مفروضہ بھی محض افسانہ ہے) اس نظام میں لوگ اس حکومت کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں جو اکثریت کی قائم کردہ ہوتی ہے۔ جس اقلیت نے ان نمائندوں کے خلاف ووٹ دیئے تھے یا جنہوں نے سرے سے ووٹ ہی نہیں دیئے تھے۔ اُن کی اطاعت کو بہ طیبِ خاطر اطاعت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔''

4۔ جمہوری نظام میں، روسو کے مفروضہ کے مطابق، حقِ اقتدار عوام کی مرضی کو حاصل ہوتا ہے اور یہ اقتدار بلا حدود قیود ہوتا ہے۔ فرانسیسی مفکر (Bertrand de Jouvenel) نے (Sovereignty) کے نام سے ایک بڑی عمدہ کتاب لکھی

ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:

بہ ادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ اگر ایک دفعہ آپ اس اصول کو تسلیم کرلیں کہ انسانی مرضی اور ارادے (Human Will) کو اقتدارِ مطلق حاصل ہوسکتا ہے تو اس کے بعد جو نظام ہائے حکومت بھی قائم ہوں گے حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اصول اسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (ص:199)

اس مفکر کی اس تحقیق کے بعد اقبالؒ کا وہ شعر پھر سامنے لائیے جو اس نے اس سے بہت پہلے کہا تھا اور جسے میں شروع میں پیشِ خدمت کر چکا ہوں کہ ؎

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

آپ نے دیکھا کہ جس شخص کی بصیرت شمعِ قرآنی سے کسبِ ضیا کرتی ہو، وہ کس قدر جلد حقائق کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے ___ کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت۔ اور اسی بناء پر وہ حتم و یقین کے ساتھ (لیکن بغیر کسی ''دعویٰ'' کے) کہہ سکتا ہے کہ ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

عدل سے مراد:

برٹرینڈ نے کہا تھا کہ انسانی ارادے کو مطلق اقتدار کا حق سونپنے کا نتیجہ استبداد اور مطلق العنانی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، خواہ نظام کوئی سا بھی کیوں نہ ہو۔ اس سے مغربی مفکرین کے سامنے یہ اہم سوال آیا کہ اگر انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہوسکتا تو پھر حقِ مطلق کسے حاصل ہوسکتا ہے؟ وہ لوگ اپنی مدّت العمر کے فکر و تجسس کے بعد اس باب میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ انتہائی غور و تعمق کا متقاضی ہے۔ ان اربابِ فکر کا کہنا ہے کہ نظامِ حکومت مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ بلند مقصد ہے قیامِ عدل اس کے بعد عدل کے متعلق ان کی تصریحات اور تقاضے ملاحظہ فرمائیے۔ مشیگن یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (William K.Frankena) لکھتا ہے کہ:

عدل قوانینِ مملکت کے مطابق فیصلوں کو کہا جاتا ہے۔ قانون کی اصطلاح میں تو ایسا کہنا درست ہوسکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود مملکت کے قوانین ہی عدل پر مبنی نہ ہوں تو ان کے مطابق عملی اقدامات کو آپ سوشل جسٹس کس طرح کہہ سکیں گے۔

5۔ اس سے یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ اگر مملکت کے قوانین بہرحال مبنی برحق و صداقت قرار نہیں پاسکتے تو پھر حق و باطل اور (Just and Unjust) کا معیار کیا ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں وہ پروفیسر (Lewis) کے الفاظ میں لکھتا ہے کہ:

حق اسے کہیں گے جو تمام حالات میں حق ہو اور ہر فرد کے لیے یکساں طور پر حق ہو۔ عالمگیریت حق کی بنیادی شرط ہے۔

6۔ نہ صرف عالمگیریت بلکہ ابدیت بھی ___ یعنی اسے ہر زمانے میں حق ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں وہ ٹینی سن کا یہ شعر نقل کرتا ہے کہ:

نیکی، صداقت یا پاکیزگی اور عدل، ان سے ابدیت کی کشش نکال دیجئے تو یہ سب راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائیں گے۔

اس کے بعد وہ (Emil Brunner) کا یہ قول درج کرتا ہے کہ:

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں، ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماورا ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لیے اس قسم کا مطلق الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ کا مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی، اور یا پھر یہ جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور خالی برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوگی۔

ابدی اور غیر متبدل قانون:

7۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے ایک ممتاز صاحبِ علم (Ernest Barker) نے سیاست مدن سے متعلق ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے جس کا نام (Principles of Social and Political Theory) ہے وہ اس میں لکھتا ہے:

اس مقام پر ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا مملکت کے آئینی قانون کے شانہ بشانہ کوئی ایسا قانون بھی موجود ہے جو حقیقی اقدار پر مبنی ہے۔۔۔ وہ قانون جسے ہم ''فطری'' کہہ سکیں کیونکہ وہ اشیائے کائنات کی فطرت، یا خود انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ قانون جو اس لحق پر مبنی ہوتا ہے۔ جو اپنی ذات میں حق ہوتا ہے جو اس عدل پر مبنی ہوتا ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں عدل ہوتا ہے۔ جو اُن اقدار پر مبنی ہوتا ہے جو اپنی قیمت آپ ہوتی ہیں خواہ انہیں آئینی حیثیت حاصل ہو یا نہ۔ یہ سوال آج کا پیدا شدہ نہیں۔ یہ (Sophocles) اور ارسطو کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ ارسطوؔ نے اس قانون میں جسے کوئی قوم خود وضع کر کے اپنے لیے اختیار کر لے اور اس میں جو تمام نوعِ انسان کے لیے عالمگیر ہو، تفریق کرتے ہوئے کہا تھا کہ مؤخر الذکر قانون، قانونِ فطرت ہے۔۔۔ وہ قانون جو اُس وقت بھی موجود ہوتا ہے۔ جب نہ کسی قوم کا وجود ہو اور نہ کسی ایسے معاہدہ کا وجود جو مختلف افراد کو ایک رشتے میں منسلک کر دے۔ اس کی تائید میں ارسطوؔ نے سوفوکلس کا یہ شعر درج کیا ہے کہ: ''اس قانون کی قوت، امروز و فردا کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ ایک

دائمی چشمہ سے پھوٹتا ہے جس کے منبع کا کسی انسان کو علم نہیں۔'' (صفحہ 98)

اس کے بعد وہ (Blackstone) کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ:

قانونِ فطرت کی اطاعت دنیا کی ہر اطاعت پر مقدم ہے۔ انسان کا وضع کردہ کوئی قانون جو اس قانونِ فطرت کے خلاف ہو، کبھی جائز قرار نہیں پا سکتا۔ (ص:100)

امریکی پروفیسر (Edward Corwin) نے جو کانسٹی ٹیوشن اور اس کی تاریخ پر اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے، ایک نہایت مختصر لیکن بڑی پُرمغز کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (The Higher Law)۔ اس کی بحث وتحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ آئین کی بنیاد اُن اصول واقدار پر ہونی چاہئے جو انسانوں کی وضع کردہ نہ ہوں اور زمان ومکان کی حدود سے ناآشنا ہوں۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ''یہ نظریہ کہ مملکت کے آئین کو اس لیے بالادستی (Supremacy) حاصل ہے کہ اس کی جڑیں عوام کے ارادے (پاپولرول) کی پیدا کردہ ہیں، امریکن آئین میں بعد کا پیدا شدہ ہے۔ ابتداء میں آئین کی فوقیت کا بنیادی معیار غیر متبدل اور ابدی عدل کا تصور تھا اور انسانی ارادہ کو اس میں نسبتاً بہت کم دخل تھا یہ نظریہ موجودہ قانون کی ضد تھا۔ اس میں اس حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا کہ کائنات میں حق وصداقت اور عدل کے ایسے اصول موجود ہیں جنہیں اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذاتی قدر وقیمت کی بناء پر باقی اصولوں پر غالب رہیں، اس بات کی پروا کئے بغیر کہ قوم کے برسرِ اقتدار طبقہ کا اس باب میں کیا طرزِ عمل ہے۔ ان اصولوں کو کسی انسانی ہاتھ نے نہیں بنایا۔ یہ اصول اگر خود خدا سے قدیم نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ ان کی رو سے خدا کا ایسا تصور سامنے آتا ہے جو انہیں کنٹرول کرتا اور باہمد گر مربوط رکھتا ہے۔ یہ اصول موجود فی الخارج۔۔۔ اور ازلی ابدی اور غیر متبدل ہیں۔'' (ص:4)

اس کے بعد کارون، مشہور مقنن (Cicero) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:

حقیقی قانون، مبنی برحکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے، منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اُسے منسوخ کرسکتی ہے۔ نہ ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی اطاعت سے آزاد کردے۔۔۔ نہ ہی اس قانون کی یہ کیفیت ہے کہ روما کے لیے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لیے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (ص:10)

اس کے بعد وہ (Cicero) کے یہ ناقابلِ فراموش الفاظ درج کرتا ہے کہ:

سچا قانون وہ ہے جو فطرت کے عطا کردہ معیار کے مطابق حق اور باطل میں امتیاز کردے۔ اس کے سوا کوئی

قانون بھی ہوا سے نہ صرف یہ کہ قانون سمجھنا نہیں چاہئے۔ اسے قانون کہنا ہی نہیں چاہئے۔ (ص:12)

نہ صرف یہ کہ ''ایسے قانون کو قانون سمجھنا اور کہنا نہیں چاہئے۔'' (Barker) کہتا ہے کہ ایسے قانون کی اطاعت ہی نہیں کرنی چاہئے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری (Loyalty) ان اقدار کے تابع ہے جن کے (تحفظ) کے لیے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر یہ مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو اُن اقدار کے تقاضے کی رُو سے میں مجبور ہوجاتا ہوں کہ اپنی وفاداری کو عدم وفاداری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کے بجائے بادلِ ناخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کرلوں۔ (ص:165)

حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے۔ جس کی رُو سے ہم پر اس کی اطاعت بہرحال واجب ہو۔ اس کے بجائے امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اُسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے اربابِ اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفا شعاری اور اطاعت ختم ہوجاتی ہے۔ (ص:193)

آگے چل کر وہ کہتا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب، مشروط ہوتا ہے، مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب ہوتی ہے جب تک یہ حق کے کسی بلند تقاضا کے ساتھ ٹکرائے نہیں۔ (ص:220)

آپ نے غور فرمایا، عزیزانِ من! کہ نظامِ جمہوریت کے تلخ نتائج کا ستایا ہوا انسان اب کس قسم کے قانون کی تلاش میں

اس میں شبہ نہیں

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے پیشِ نظر پورے کے پورے معاشرہ میں قرآنی انقلاب پیدا کرنا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک معاشرہ میں ایسا انقلاب نہ آجائے، ہم اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کریں۔ غلط معاشرہ کی بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جن پر انفرادی طور پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے لیکن زندگی کے جن دائروں میں ہم مجبور نہیں، وہاں کونسی چیز مانع ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے اندر حسنِ سیرت پیدا نہ کریں؟ اپنی ہر کمزوری کے لیے معاشرہ کی مجبوری کو سپر بنالینا، بہت بڑی خودفریبی ہے۔ قرآن کا نام لینے والوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو اس قسم کی خودفریبی میں مبتلا رکھیں۔ صداقت، اخوت، محبت، شفقت، حسنِ معاملہ، ایفائے عہد، کشادہ نگہی، وسعتِ ظرف، تحمل، بردباری، پاکیزگی، عمدہ خیالات، عفتِ قلب ونظر۔ یہ ہمارے امتیازی نشان ہونے چاہئیں، میں نے ان چند خصوصیات کا ذکر محض مثال کے طور پر کیا ہے۔ مجملاً یوں سمجھئے کہ ہماری ساری زندگی سیرتِ محمدیہؐ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہئے۔ کہ قرآن فہمی کا فطری نتیجہ یہی ہے ؎

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی ست

(پرویزؒ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

ہے۔ایک ازلی وابدی، عالمگیری قانون جس کا سرچشمہ انسانی فکر سے بلند اور ماوراء ہو!

اس کے بعد مغرب کا یہ مفکر بصد حرمان ویاس، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے کہ جمہوری نظام کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے متلاشیانِ حقیقت کی مشکل یہ تھی کہ اس قسم کے قوانینِ فطرت کا ضابطہ کہیں موجود نہ تھا۔

(Barker Page:100)

مفکرینِ مغرب کی دُشواری:

انسانوں کے خودساختہ قوانین وضوابط کا ستایا ہوا انسان آج بھی اپنے آپ کو اسی مقام پر پاتا ہے جہاں اُس زمانے کا انسان تھا جس نے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے استبداد سے نجات کی راہ نظامِ جمہوریت میں سمجھی تھی۔اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ جسے چشمۂ حیات سمجھ کر اس کی طرف لپکا تھا وہ سراب ثابت ہوا اور چشمۂ حیات کا اب بھی اسے کوئی سراغ نہیں مل رہا اگرچہ اس کی تلاش میں وہ اس قدر سرگرداں وحیراں اور مضطرب وبیتاب ہے۔ان کی فکر نے انہیں اتنا تو بتادیا ہے کہ وہ ضابطہ قوانین جس میں انسانیت کی نجات کا راز مضمر ہے، کس قسم کا ہونا چاہئے۔وہ ازلی ابدی، زمان ومکان سے ماوراء، عالمگیر ہونا چاہئے۔وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکے ہیں۔کہ ایسا قانون انسانوں کا خودساختہ نہیں ہوسکتا۔انسانی فکر ایسا ضابطہ قوانین وضع ہی نہیں کرسکتی۔اس کا سرچشمہ انسانی فکر سے ماوراء ہونا چاہئے۔وہ یہاں تک تو پہنچ گئے ہیں۔لیکن وہ اُسے منزل من اللہ یا وحی کہہ کر نہیں پکارتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے اُسے قانونِ خداوندی کہہ دیا تو پادری یہ کہتے ہوئے بھاگے بھاگے آجائیں گے کہ جس قانونِ خداوندی کے تم متلاشی ہو وہ قانون ہم دے سکتے ہیں کیونکہ ہم خدا کے نمائندے ہیں۔اس سے ان پر تھیاکریسی کا وہی استبداد پھر مسلط ہوجائے گا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے انہوں نے نظامِ جمہوریت وضع اور اختیار کیا تھا۔اس ڈر سے وہ اپنے مطلوبہ ضابطۂ قوانین کو قانونِ فطرت یا فطرتِ انسانی میں مضمر قانون جیسی مبہم اصطلاحات سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کی دوسری مشکل یہ ہے کہ انہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ قانون ملے گا کہاں سے؟ فکرِ مغرب کی یہی بے کلی اور بیتابی اور دوسری طرف بے بسی اور بے چارگی تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا

(پہلے مصرعہ کا مفہوم ہے کہ ''عشق ومحبت کا جذبہ ناپید ہے اور عقل اس کو سانپ کی طرح مسلسل ڈستی ہے۔س۔ا)

اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(جاری ہے)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

چیف جسٹس پاکستان کی خدمتِ عالیہ میں گذارش

دیت کا قرآنی مفہوم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کے متبعین نے خود ہی رہبانیت شروع کی تھی۔ ہم نے ان کے لئے رہبانیت فرض نہیں کی تھی اور پھر وہ اس کو نبھا بھی نہیں سکے 57:27۔ قرآن کریم نے اوّل دن سے رہبانیت کی مذمت کی اور اللہ کی اطاعت کو ایک نظام کی اطاعت سے وابستہ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے نبوت کے شروع میں ہی اسلامی نظام کے قیام کی کوششیں کیں، اپنے سامنے نظام قائم فرمایا اور اس نظام کی اطاعت کو عبادت خداوندی قرار دیا۔ اگر عبادت خداوندی اسلامی نظام کے ذریعے نہ ہوتی تو حضور ﷺ اس قدر جدوجہد کر کے نظام کیوں قائم فرماتے۔ حضور نے 82 لڑائیاں مشرکین سے لڑیں لیکن نظام قائم کر کے چھوڑا۔ دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اگر عبادت خداوندی نظام کے ذریعے نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اولوالامر کی اطاعت کو فرض قرار نہ دیتا۔ قرآن کی رُو سے اولوالامر کی اطاعت اسی طرح فرض ہے جس طرح رسول کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ اولوالامر کی اطاعت کے بغیر رسول کی اطاعت نہیں ہوسکتی ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل چیز نظام کی اطاعت ہے۔ لیکن خلافت راشدہ کے بعد سے ہم سب مسلمان رہبانیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رہبانیت صرف جنگلوں، پہاڑوں، ویرانوں میں پرستش کرنے کا نام نہیں ہے۔ قرآن کی رُو سے، اسلامی نظام کو نظر انداز کر کے، براہِ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا اور انفرادی نجات طلب کرنا، رہبانیت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہے۔ اعتکاف میں بیٹھنا، 40,40 دن کے چلوں پر نکل پڑنا، اور ہر طرح کی پرستش رہبانیت میں شامل ہوتی ہے ہمارا سارا فقہ ہمارے علماء کرام اور فقہا عظام کی ذاتی آراء ہیں۔ یہ فقہ کسی اسلامی مملکت کا جاری کردہ نہیں ہے، اس لئے یہ نہ اسلامی ہے اور نہ اس کی اطاعت فرض ہے۔ اول تو ہمارے فقہ کے ماخذ (Sources) ہی غلط ہیں۔ اسلامی مملکت کا Constitution صرف قرآن ہوتا ہے۔ مملکت کا سربراہ اور قانون ساز ادارے خود قرآن سے قوانین استنباط کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور ان قوانین کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ ان قوانین کا اطلاق اُن ہی کے دور تک ہوگا، آئندہ کی نسلوں کے لئے ان کی اطاعت فرض نہیں ہوگی، اگلی نسلیں اپنا قانون خود قرآن کی حدود میں وضع کرتی چلی جائیں گی۔ فقہ کوئی جامد Static چیز نہیں ہوتا۔ اگر سابقہ نسل کے قانون اور موجودہ دور کی نسل کے

قانون میں کوئی فرق ہوگا' تو موجودہ نسل سابقہ قانون کو رد کردے گی۔ ہر نسل اپنے دور کے موجودہ تقاضوں کے مطابق قانون بناتی چلی جائے گی۔ لیکن یہ شرط ہر وقت پیش نظر ہوگی کہ قانون قرآن کی حدود میں ہو' اس سے سرمو انحراف نہیں ہوسکتا۔

اِس مختصر سی تمہید کے بعد دیت کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں دیت کا ذکر دو مقامات پر آتا ہے۔ ایک سورۃ بقرہ 178 اور دوسرا مقام سورۃ النساء 92 میں۔ سورہ بقرہ میں اصول ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قتل کا بدلہ قتل ہے۔ اس جگہ قتل کی تفصیل بیان نہیں فرمائی۔ لیکن سورہ النساء میں قتل کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور قتل عمد اور قتل خطا میں فرق بیان کیا گیا ہے اور ان کی سزاؤں میں بھی فرق بیان کیا' اگر قتل عمد اور قتل خطاء جرم کو نوعیت اور اس کی سزا میں فرق نہ ہوتا' تو قرآن اِس فرق کو کیوں بیان فرماتا۔ آپ پہلے دونوں آیات کریمات مع ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ ہم فقہ کی اصطلاحات کو نظر انداز کر کے مسئلہ کو نہایت آسان کر کے تحریر کریں گے۔ البتہ آپ پہلے مسئلہ کو سمجھ لیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے قتل عمد کی سزا صرف قتل ہے' لیکن قتل خطا کی سزا میں دیت شامل ہے۔ ہمارے ہاں فقہ شریف میں قتل عمد کی سزا میں بھی دیت کو شامل کر دیا ہے۔ اور یہ قرآن کے خلاف ہے' ہم یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ فقہ شریف کا یہ فیصلہ کہ قتل عمد کی سزا بھی دیت ہے غلط ہے اور قرآن کے خلاف ہے اور قتل عمد کی سزا صرف قتل ہے' دیت ہرگز ہرگز اس میں شامل نہیں ہے۔ آپ اب دونوں آیات ایک جگہ ملاحظہ فرمائیں۔

(1) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ (2:178)

ترجمہ: اے ایمان والو جو لوگ ناحق مارے جائیں ان کے بدلے میں تم کو جان کے بدلے جان لینے کا حکم ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد' غلام کے غلام' عورت کے بدلے عورت' پس جس قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو اسے بھی اسی کے قدم بقدم نیکی کرنا اور خوش معاملگی سے خون بہا ادا کر دینا چاہئے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے۔

(2) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ (4:92)

ترجمہ: کسی مومن کو یہ جائز نہیں کہ کسی مومن کو جان سے مار ڈالے' مگر خطا سے جو شخص کسی مومن کو خطا سے قتل کر ڈالے تو اس پر ایک ایماندار غلام کو آزاد کرنا اور مقتول کے قرابت داروں کو خون بہا دینا لازم ہے۔ مگر جب وہ لوگ معاف کر دیں تو پھر اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہے جو تمہارے دشمن ہیں اور خود قاتل مومن ہے تو صرف ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا اور اگر

مقتول ان لوگوں میں سے ہو جن کا تم سے عہد و پیمان ہو چکا ہے تو قاتل پر وارثانِ مقتول کو خون بہا دینا اور ایک بندۂ مومن کا آزاد کرنا واجب ہے۔

آپ نے دونوں آیات مع تراجم ملاحظہ فرمائیں ان کو ذہن میں مستحضر رکھیں۔ پہلی آیت میں قصاص کے حکم پر اصرار ہے تاکہ سوسائٹی میں امن و امان قائم رہے یہ واضح رہے کہ قصاص کے معنے بدلہ لینا یا سزا دینا نہیں ہے بلکہ قصاص کے معنے مجرم کا تعاقب کرنا اور ان کو ہر حالت میں trace out کرنا ہے۔ قتل کے بدلے قتل کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بات واضح کی گئی ہے کہ قتل کے بدلے میں رتبہ اور Status کا کوئی خیال نہ رکھا جائے۔

دوسری آیہ کریمہ میں قرآن نے قتل کی وضاحت کی ہے اور قتل عمد اور قتل خطا کا فرق واضح فرمایا ہے۔ چونکہ دونوں قتل کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اِس لئے ان کی سزاؤں میں بھی فرق رکھا ہے۔ قتل بالخطا میں دیت کا حکم ہے۔ اِس دیت کے ادا کرنے کی تفصیل بھی بیان فرمائی ہے۔ ہمیں دیت کی ادائیگی کی تفصیل سے یہاں کوئی بحث نہیں۔ اس کا اصل issue سے تعلق نہیں۔ اصل issue تو یہ ہے کہ قتل عمد میں دیت کی اجازت بالکل نہیں ہے۔

قرآن کریم کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ قرآنِ کریم اپنا مفہوم تصریف آیات سے واضح کرتا ہے قرآن نے فرمایا کہ جو چیز چاہو کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو 7:31، لیکن تین مقامات پر 4 چیزوں، مردار لہو، سور کا گوشت، اور منسوب اِلیٰ غیر اللہ کو حرام قرار دے دیا۔ ان چار چیزوں کا کھانا حرام ہے (5:3, 16:115, 2:173) اسی طرح قرآن نے نکاح کا حکم دیا کہ جو عورتیں تمہیں پسند کریں تم ان سے نکاح کر لو 4:3، لیکن دوسرے مقام پر محرمات کی فہرست دے کر فرمایا کہ ان عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے (4:23)۔ قتل کی سزا کے بارے میں بھی قرآن نے دو جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک مرتبہ سورۂ بقرہ میں مطلق قتل کا ذکر ہے وہاں قصاص پر اصرار اور قاتل کے مرتبہ کی تردید کی گئی ہے۔ سورہ النساء میں قتل کی نوعیت کو واضح کیا اور اس میں قتل بالخطاء میں دیت کے حکم کو شامل کیا۔

چونکہ ہماری زندگی پر رہبانیت کا اثر ہے اور ہم ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی نظام کو درمیان میں نہ آنے دیں اس لئے ہمارے فقہ نے اس قتل کو فرد کے خلاف جرم قرار دیا ہے حالانکہ قتل عمد ریاست کے خلاف Crime ہے۔ مجرم کو تلاش کرنا ورثا کا کام نہیں ہے اور نہ ہی بدلہ لینا ورثا کا کام ہے۔ اگر وارث کمزور ہیں تو وہ تو بدلہ لے ہی نہیں سکتے۔ قرآن کریم میں جہاں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ (2:183) کے الفاظ آتے ہیں، اس میں اصل تخاطب اسلامی نظام سے ہوتا ہے۔

سورۂ نساء کی آیت میں جب واضح طور پر ''وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا'' (4:92)'' میں خطاء کا لفظ داخل کر دیا تو یہ اس بات کی محکم، اور نا قابل تردید دلیل ہے کہ دیت کا انحصار صرف اور صرف خطاء پر ہے۔ یہاں قرآن نے خطاء کے لفظ کو

شامل کر کے قتل عمد کو دیت سے خارج کر دیا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ قتل عمد اور قتل خطاء دونوں صورتوں میں اصل ذمہ داری سٹیٹ کی ہے۔ ورثا پر نہ کوئی ذمہ داری ہے نہ ان کا کوئی بنیادی کردار ہے۔ قتل خطاء میں بھی دیت کی رقم کا تعین اور اس کی لین دین حکومت کی معرفت ہوگی۔ ورثا کو از خود معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے' کیونکہ ورثا متوفی کے ترکے کے وارث ہوتے ہیں' اس کی جان کے وارث نہیں ہوتے۔

یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ اللہ کے نام پر معاف کرنے کا طریقہ بھی رہبانیت کا طریقہ ہے۔ اسلامی مملکت میں کسی شہری کا کوئی تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ سے نہیں ہوتا۔ صرف نظام کی معرفت ہوتا ہے اور اسی کی معرفت اطاعت و معصیت ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ اے ایمان والو اللہ کو قرضہ دو 73:20' اس کے یہ معنے نہیں کہ لوگ روپوں کی بوریاں لے کر آسمان پر اللہ تعالیٰ کو رقم دے آئیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ کے نظام کو قرض دو اور اس کو مضبوط کرو۔ اللہ کے نام پر معاف کرنے کا یہ تصور رہبانیت کا ہے۔ قرآن کی رو سے اللہ کے نام پر معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جسے معاف کرنا ہے اسے نظام کی معرفت معاف کیا جائے۔

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ یہ بات بالکل صاف ہے کہ قرآن نے دیت کی سزا صرف قتل خطاء میں رکھی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے فقہ نے اتنی بڑی لغزش کی کہ اس میں قتل عمد کو بھی شامل کر لیا۔ اس کی وجہ آیہ کریمہ کا یہ حصہ ہے ''فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ (2:178)'' (ترجمہ) ''جسے اس کے بھائی نے کچھ معاف کر دیا ہو''۔ آیہ کریمہ کے اس حصہ کا تعلق قتل خطاء سے ہے۔ اس کا تعلق قتل عمد سے ہے ہی نہیں۔ ہمارے فقہ نے اس حصہ کا تعلق قتل عمد سے کر کے بڑی لغزش کی اور اسی وجہ سے یہ ساری پیچیدگی پیدا ہوئی۔ آپ خود غور فرمائیں کہ اس آیت کا تعلق اس جرم سے ہو ہی نہیں سکتا جس کی سزا موت ہو۔ کیونکہ موت کی سزا کا کوئی حصہ معاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اِس آیت کا تعلق اس جرم پر ہوگا جس کی سزا کا کوئی حصہ معاف کیا جا سکتا ہو۔ یہ سزا' دیت' قتل خطاء کی ہے۔ کیونکہ قتل عمد کی سزا' موت میں سے کوئی شے معاف ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا سورہ بقرہ کی آیت کو سورہ النساء کی آیت کے ساتھ پڑھ کر مطلب واضح ہوتا ہے کہ

(1) قتل عمد کی سزا موت ہے جس میں سے کچھ معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(2) کچھ معاف کرنے کا سوال اسی جرم کے ضمن میں ہو سکتا ہے جس کی سزا ایسی ہو جس میں سے کچھ معاف کیا جا سکے' اور وہ جرم قتل خطاء ہی ہو سکتا ہے' قتل عمد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قتل عمد میں بھی دیت کی اجازت ہے تو معاشرہ میں قتل کا دروازہ کھل جائے گا۔ امیر آدمی قتل کر کے دیت دے دیں گے اور غریب آدمی بالکل غیر محفوظ ہو جائے گا۔

یہاں دیت سے متعلق مضمون ختم ہو گیا۔

روزنامہ دی نیوز مورخہ 22 ستمبر 2013ء میں ایک مضمون جناب محترم افتخار مرشد صاحب کا طبع ہوا ہے۔ جس میں اُنہوں نے دیت کے موضوع پر تبصرہ کیا ہے۔ ہمارے ہاں اتفاق سے چونکہ صرف دیت کے متعلق واقعات پیش آ رہے ہیں اس لئے یہ موضوع بار بار زیر بحث آ رہا ہے۔ لیکن آپ یقین کریں کہ ہمارا فقہ کا اکثر حصہ اسی طرح کے خلافِ قرآن قوانین پر مشتمل ہے۔ اب جو کوئی مسئلہ بھی پیش آئے گا یہ بات کھلتی چلی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو یہ ایک ہزار سال پیشتر کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ اس کے ماخذ (Sources) ہی غلط ہیں۔ اِس کے وضع کرنے کا طریقہ غلط ہے۔ یہ تو ہمارے علمائے کرام اور فقہائے عظام کی ذاتی' انفرادی آراء ہیں۔ ان کو حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام جعفر صادقؒ کی طرف منسوب کیا ہوا ہے۔ ان دونوں حضرات کی کوئی کتاب ہی موجود نہیں ہے۔ دیت کے بارے میں ہمارے دانشور' اینکرز' اور T.V. چینلز کے مباحثوں میں حصہ لینے والے حضرات' سب اِس قانون پر اعتراض کرتے ہیں کہ قتل عمد میں خوں بہا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ لیکن جب ان کے سامنے شرعِ شریف کا حوالہ دے دیا جاتا ہے۔ تو وہ خاموش ہوجاتے ہیں۔ ان حضرات میں سے کوئی شخص یہ تکلیف گوارا نہیں کرتا کہ وہ خود براہِ راست اِس قانون پر غور کرے۔

محترم جناب افتخار مرشد صاحب نے اپنے قیمتی اور علمی مضمون میں' جناب چیف جسٹس افتخار محمد چودہری صاحب کی رائے دیت کے بارے میں نقل کی ہے۔ ہم محترم چیف جسٹس صاحب کی رائے ان کے الفاظ میں لکھ رہے ہیں۔ آپ خود ملاحظہ فرمالیں۔

"Pardoning a murder" in the name of God was a travesty and amounted to circumvention of the Law"

محترم جناب چیف جسٹس کے الفاظ تو چند ہی ہیں لیکن ان کا مفہوم بہت وسیع وعمیق ہے۔ اِس سے زیادہ بھرپور تبصرہ اور نہیں ہوسکتا ہے۔ ہم جناب چیف جسٹس صاحب کی خدمتِ عالیہ میں اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ وہ ہمارے فقہ کو قرآن کے مطابق بنانے کی راہ ڈال دیں تاکہ ہمارا فقہ قرآن کے مطابق ہوجائے۔ اور اسلامی قانون اضحوکہ بننے سے بچ جائے یہ آپ کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ یہ کام ایک دو دن کا نہیں ہے۔ اس میں بڑی محنت درکار ہے۔ اِس کی شدید ترین مخالفت ہوگی۔ اس میں Spade work تحریک طلوع اسلام بڑی حد تک کر چکی ہے۔ اِس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اب بھی تحریک طلوع اسلام مزید مدد دے سکتی ہے ضرورت صرف خلوص اور جرأت کی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ جو شخص اِس دور میں اسلامی فقہ کو قرآن کے مطابق بنائے گا۔ اس کا درجہ اس دور کے امام ابوحنیفہ کے برابر ہوگا۔ ہماری دُعا ہے کہ یہ سعادت آپ کے حصہ میں آجائے۔ اللہ تعالیٰ خود آپ کی مدد فرمائے گا۔ کیونکہ اس کا وعدہ ہے کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (47:7) اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا' اللہ کی مدد یہی ہے کہ اس کے قانون کو صحیح طور پر معاشرہ میں جاری کیا جائے۔ ادارہ طلوع اسلام کی ہر طرح کی مدد آپ کے لئے حاضر ہے۔

عبداللہ ثانی، پشاور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تبصرۂ کتب

قرآن: جدید تحقیقات کی روشنی میں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَوۡ اَنَّ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَۃٍ اَقۡلَامٌ وَّالۡبَحۡرُ یَمُدُّہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ سَبۡعَۃُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ کَلِمٰتُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۷﴾ (31:27)

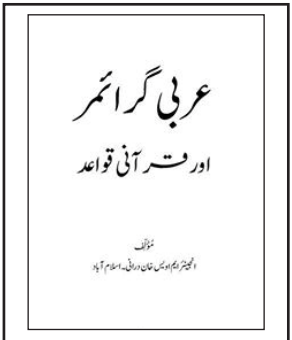
ترجمہ: اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں اور سمندر (کا تمام پانی) سیاہی ہو (اور) اس کے بعد سات سمندر (کا تمام پانی) اور سیاہی ہو جائیں تو خدا کی باتیں (یعنی اس کی صفتیں) ختم نہ ہوں۔ بے شک خدا غالب حکمت والا ہے۔

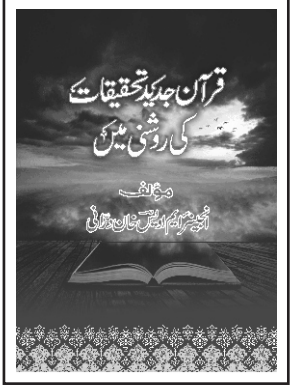
مفہوم: اس کائنات کی وسعتوں اور قوانین خداوندی کی حدود فراموشیوں کا یہ عالم ہے کہ اگر تمام روئے زمین کے درخت قلم بن جائیں اور موجودہ سمندر سب روشنائی میں تبدیل ہو جائیں اور ان کے ساتھ کئی اور سمندر بھی ملا دیئے جائیں ___ تو بھی ان قوانین کا احاطہ نہ ہو سکے اور یہ قوانین جہاں اتنی قوت رکھتے ہیں کہ اس قدر عظیم القدر نظامِ کائنات کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکیں اس کے ساتھ ہی یہ علم وحکمت پر مبنی ہیں۔ یونہی اندھی قوت کی بناء پر نافذ العمل نہیں۔

قرآن کریم پر آج تک جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس کا احاطہ کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ جوں جوں انسان ترقی کی منازل طے کرتا جائے گا۔ قرآن کریم ان بھیدوں کو آشکار کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوگا۔ مسلمانوں نے اگر قرآن کریم پر تفاسیر کی حد تک کام کیا ہے تو مستشرقین بھی کم پیچھے نہیں رہے اور یہی وہ اعجاز ہے جو صرف اور صرف قرآن کریم کو حاصل ہے۔ اِن عظیم الجثہ تحقیقات میں جناب انجینئر محمد اویس خان درّانی صاحب کی زیرِ عنوان تالیف ''قرآن جدید تحقیقات کی روشنی میں'' نے گراں قدر اضافہ کر کے قرآن کریم سے عشق رکھنے والوں کے لیے مزید تحقیق کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ کتاب میں تقریباً تین سو موضوعات میں سے ہر ایک پر زیادہ سے زیادہ دو تین صفحات میں قرآن کی آیات سے جواب مہیا کیا گیا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے یہ محاورہ اس کتاب پر پورا اُترتا ہے۔ اگرچہ کتاب عام فہم ہرگز نہیں لیکن یونیورسٹی لیول اور ریسرچ کنندگان کے لئے بنا بنایا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ کتاب کو حوالہ / ریفرنس بک کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں کتاب کا مطالعہ بہت کم ہوتا جا رہا ہے جس سے بات کرو یا کسی موضوع پر اظہارِ خیال کا موقعہ آتا ہے تو فوراً جواب دیا جاتا ہے ''ذرا نیٹ پر دیکھتے ہیں۔ نیٹ جس کا ترجمہ ''جال'' ہے۔ ''جال'' میں پھنسا ہوا جواب کب کتاب کے برابر ہو سکتا ہے؟ کتاب کا پس منظر یقیناً دلچسپی کا حامل ہوگا۔

یہ سال 2002ء کی بات ہے۔ راقم قدیر احمد خان مرحوم کی بیمار پرسی کے لیے گیا تھا۔ مرحوم کے بستر کے تینوں اطراف کتابوں سے اٹے پڑے تھے۔ کہنے لگے آج آپ کی ملاقات ایک عاشق قرآن سے کرواتا ہوں۔ قدیر احمد خان مرحوم کو

اقبال مرحوم کے سینکڑوں اشعار ازبر تھے۔ ابھی یہ بات ختم ہی نہ ہوئی تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ آجاؤ! سلام کے ساتھ ہی ایک شخصیت نے کہا۔ ''گل کلام ہے۔ ایک گھنٹے کی ملاقات میں ہم تھے جناب انجینئر محمد اویس درّانی تینوں کی سوئی قرآن کریم پر اٹکی ہوئی ہوتی رہی۔ اُس کے بعد اچانک یہ مارچ 2017ء کو گھنٹی بجی۔ میں نے لگے میں نے تیرہ سو صفحات پر مشتمل معلوم ہوا درّانی صاحب بحر قرآن میں تحقیق کی روشنی میں'' اور ''عربی گرائمر'' نے دس سال کی محنت شاقہ کے بعد روشنی میں ایسا ٹٹولا کہ جس کا جواب افادیت پر آگے بات کروں گا۔ دس طرف جانے والے راستے کا انتخاب





گلزار'' جلد ہی معلوم ہوا کہ یہ آپ کا دعائیہ تکیہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ یہ صاحب جو میخانۂ پرویزؒ کے بادہ کش تھے۔ ہم تھی۔ چار پانچ سال تک ٹیلیفون پر بات چیت سلسلہ رک گیا۔ دس سال گزر گئے۔ آواز پہچانی، ساتھ ہی کہنے لگے ''گل گلزار'' کہنے ایک کتاب تالیف کی ہے۔ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ غوطہ زن تھے۔ نکلے تو دو کتابیں ''قرآن جدید کی کتاب ہاتھ میں لیے تھے۔ درّانی صاحب تقریباً بائیس مشہور زمانہ کتابوں کو قرآنِ کریم کی نہیں۔ سوچتا ہوں کہ بہت بڑا کام کیا۔ کتاب کی سال میں درّانی صاحب نے بہشت بریں کی کیا۔ راقم نے اس دوران کیا کیا؟

شوگر کی وجہ سے آدھی بتیسی ہار گیا۔ خون میں اتنی شوگر ہے کہ مجھے کسی کارخانے کو لگانے کی ضرورت نہیں۔ رعشے نے دونوں ہاتھوں پر حملہ کیا ہے۔ لکھنا اور بولنا دشوار ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ قبل دونوں آنکھوں کے سامنے مچھروں کے غول دوغول ہوا میں اُڑتے نظر آتے رہے۔ دو دن مسلسل تالیاں بجاتا رہا۔ یہ کیسے مچھر ہیں ایک بھی ہاتھ نہیں آتا۔ آخر شکایت کی تو ڈاکٹر نے کہا دونوں آنکھوں میں موتیا اُتر آیا ہے۔ یہ مچھر نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! میں نے تو گلاب کی تمنا کی تھی۔ کہنے لگے۔ کوئی بات نہیں۔ آپ کی خواہش گلاب کے قطروں سے پوری کردوں گا۔ دن میں تین بار قطرے ڈالیئے میں نے کہا اس کا علاج۔ کہا پریشن، پوچھا کب؟ کہا جب تک شوگر ڈاؤن نہ ہو۔ اب شوگر نے دونوں ٹانگوں کو بھی گھیر لیا۔ دس منٹ کھڑا نہیں ہوسکتا ہوں۔ یہ تھی میری دس سالہ کارگردگی اور دوسری جانب محترم درّانی صاحب بحر قرآن میں ایسے غوطہ زن ہوئے، نکلے تو دو انتہائی پُرمغز کتابیں لہراتے ہوئے نکلے۔ ''قرآن جدید تحقیقات کی روشنی میں''، تخلیق آدم سے لے کر عروجِ آدم خاکی کے ان تمام ارتقائی عوامل پر مختصر اور جامع انداز میں جو کچھ بتایا گیا ہے۔ ایک عرصہ تک شاید کوئی اس کے مقابل آئینہ رکھے۔ کسی نے اگر جرأت بھی کی تو وہ درانی صاحب کی تالیف کا چربہ ہوگا۔ کتاب سے قاری کے لیے اقتباس پیش کرنا خود ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ بہرحال ''مشتے از خروارے'' کے مصداق ایک چھوٹا سا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ ارتقاء کے حوالہ سے درّانی صاحب نے قرآنِ کریم کی سورۃ الانعام آیت 98 کا حوالہ دیا ہے۔ ''ارتقاء'' وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ط (6:98) ''نظریہ ارتقاء کی بنیاد یہ ہے کہ زندگی جامد نہیں بلکہ متحرک ہے یہ اپنے اولین جرثومہ سے حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ لیکن مسلسل حرکت نہیں کئے جاتی۔ ایک منزل میں آکر تھوڑی دیر کے لیے

رکتی ہے۔ وہاں کے ماحول سے سامان نشوونما اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ اور جب اس میں اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو پھر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح وہ رکتی اور چلتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہیں: فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ط (6:98) جو بڑی جامع اور لطیف اصطلاحات ہیں۔ جب کوئی شے حرکت کرتی ہوئی کسی جگہ رک جائے تو اسے قرار کہتے ہیں۔ رکی ہوئی تو منجمد شے بھی ہوتی ہے لیکن اس کے لیے قرار کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ یہ لفظ صرف متحرک اشیاء کے عارضی طور پر رک جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس رکنے کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ قرآن نے اسے مُسْتَوْدَعٌ ط (6:98) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی کسی کی امانت کسی کے سپرد کرینا ''یعنی یہ چیز اس منزل کے پاس جو اس کا ''فَمُسْتَقَرٌّ'' تھا۔ فطرت نے بطورِ امانت رکھی تھی۔ اس نے وہ امانت اس کے سپرد کر دی جس کی وہ امانت تھی۔ اس طرح فَمُسْتَقَرٌّ اور مُسْتَوْدَعٌ کی منزلیں طے کرتی ہوئی، زندگی سلسلہ ارتقاء کی آخری حدود تک پہنچ گئی۔ سائنس کے اس مشکل مضمون کو بھی قرآن نے کس قدر شاداب وشگفتہ انداز میں پیش کر دیا۔ لیکن یہ حقائق صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جو تفقہ (غور وفکر) سے کام لیں۔

زندگی کی اگلی بلند منزل مُسْتَوْدَعٌ ہے۔ اگر جدوجہد جاری رکھے تو یہی مُسْتَوْدَعٌ اس کا مستقر بن جاتا ہے اور اسے اگلی منزل میں پہنچا دیتا ہے۔'' صفحہ 301۔ کتاب ہذا میں ارتقاء سے متعلق کئی باب ہیں۔ ارتقاء کی منازل کو قرآن کریم کی کئی آیات سے ثابت کیا گیا ہے۔ بلکہ میرے خیال میں کتاب کا موضوع ہی ارتقاء ہے۔ ویسے تو ایک اقتباس کافی نہیں لیکن کیا کیا جائے بس پوری کتاب پڑھنے سے یہ مشکل ترین مسئلہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس گل گلزارِ قرآن سے مؤلف نے جن پھولوں کو چنا ہے قابل رشک ہیں۔ ایک چھوٹا سا اقتباس صفحہ 805 سے پیش کرتا ہوں۔ اس میں یقین کی تین منازل بتائی گئی ہیں۔

علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین

''قرآن نے تمام توہم پرستیاں، پیشگوئیاں، قسمتوں کا حال، علم لدنی وغیرہ آ کر ختم کر دیا۔ قرآن نے یقین کے تین درجے بتائے ہیں۔ پہلا علم الیقین، یعنی آنکھوں سے دیکھ لینا مگر یہ آخری درجہ نہیں۔ جیسے آگ کا دھواں اٹھتا ہے تو ہم علم کے ذریعے اندازہ لگاتے ہیں کہ آگ ہے۔ جب سامنے بھڑکتی نظر آئے تو عین الیقین۔ جب اس میں انگلی ڈال دو تو وہ جلا دے یہ ہے حق الیقین۔

آئندہ ایڈیشن کے لیے راقم صرف تجاویز دے سکتا ہے۔ کتاب کی ضخامت تقریباً تیرہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ عام قاری اسے برداشت کرنے سے رہا۔ اگر اسے دو جلدوں میں کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کی آیات کا ترجمہ بہت ضروری تھا۔ اس طرح یہ عام فہم بھی ہو سکتی تھی۔ علامہ اقبال مرحوم کے فارسی اشعار کا لفظی ترجمہ بہت ضروری تھا۔ اگرچہ اس سے کتاب کی ضخامت اور بھی بڑھ جاتی لیکن اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ کتاب عام فہم ہو جاتی۔ بہرحال کتاب کے لیے راقم الفاظ کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ وجہ کم مائیگی رہی۔

کتاب ''قرآن، جدید تحقیقات کی روشنی میں'' اعلیٰ سفید کاغذ کے 1288 صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت مبلغ -/1200 روپے ہے۔ اسی طرح کتاب ''عربی گرامر اور قرآنی قواعد'' اعلیٰ سفید کاغذ کے 559 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور قیمت -/500 کچھ زیادہ نہیں۔ یہ دونوں کتب مندرجہ ذیل فون نمبر پر رابطہ کر کے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر 6)

دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

نظریہ ارتقاء میں انسانی ذات سے قبل انسان کی حیوانی زندگی کے مقام تک کا سفر:

ہماری کتاب کا عنوان کلامِ الٰہی میں قرآن کے دوقومی نظریہ پر قیامِ مملکتِ اسلامیہ کا مطالبۂ پاکستان ہے اور بنیادی طور پر موضوع سے متعلقہ درجِ ذیل اصطلاحات پر مشتمل ہے:

(1) قرآن، (2) دوقومی، (3) نظریہ، (4) مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ

مشہور مغربی مُفکر والٹیر نے فرمایا تھا کہ اگر مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو، تو اپنی اصطلاحات کی تعریف کرو۔ یہی منطق گفتگو کرنے کی ابتدا اور انتہا ہے۔ آپس میں گفتگو کرتے وقت جن اصطلاحات کا استعمال کیا جاتا ہے، اُن سے ہم جو مفہوم لیتے ہیں، وہ مخاطب پر شروع ہی میں واضح کر دینا چاہیئے، تاکہ اُس کی وضاحت کی روشنی میں اصطلاحی مفہوم کے اصل مدعا کو سمجھ کر گفتگو کو آگے بڑھایا جا سکے۔ اگر ایک دوسرے سے مخاطب افراد جن اصطلاحوں کو وہ استعمال میں لا رہے ہیں، اُن کا آپس میں متضاد مفہوم لے رہے ہوں تو ایسے مباحث حقیقت تک رسائی کے حصول کی جگہ بے معنی مناظرہ کے دوائر ہی میں گھومتے رہیں گے۔ لہٰذا ہم درجِ بالا اصطلاحوں کا جن کا استعمال اپنی تصنیف میں کر رہے ہیں، اُن کا جو مفہوم عصرِ حاضر اور قرآنی علوم کی روشنی میں لے رہے ہیں، پیشتر اس کے کہ اِن موضوعات کو زیرِ بحث لایا جائے، ہمیں یہ حقیقت ذہن میں رکھنی ہوگی کہ ہماری کتاب دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان کا موضوع بنیادی طور پر نوعِ انسانی کو مخاطب کر کے اور اُسی کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سامنے لایا جا رہا ہے۔

اِس نظریہ کی رو سے انسانوں کا چاہے وہ انفرادی حیثیت میں ہو اور چاہے اجتماعی سبھی کے مفاد کا مقصد بتدریج نشوونما کرتے ہوئے اپنی بقاء اور پھر ارتقاء کی اگلی منازل کے حصول میں وابستہ ہے۔ ہمارے موضوع کا مخاطب چونکہ خود انسان ہے، لہٰذا اِس نسبت کی وجہ سے ضروری ہے کہ انسان کی ماہیت اور اُس کے کائنات میں مقام کو سمجھنے کے لئے شروع ہی میں ہر مُمکن کوشش کی جائے۔ ہمارے زمانہ کی تحقیق اور قرآن کی تعلیم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ انسان کی پیدائش کے موضوع کا تعلق نظریہ ارتقاء کی روشنی میں ثابت کیا جاتا ہے لہٰذا نظریہ ارتقاء کے نقطہ نظر سے اِس باب میں پہلے مرحلہ میں آغاز سے لیکر انسان کی طبیعی زندگی کی رسائی تک کے ارتقاء کے سفر کا قدیم مذہبی نظریہ سے لے کر عصرِ حاضر کے نظریات کی روشنی میں اِس

کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

قدیم مذہبی نظریہ ارتقاء:

چودہ سو سال پہلے ہی نہیں، جب قرآن کی ہمیں راہنمائی ملی، بلکہ اُس سے بھی بہت پہلے تورات اور دیگر مذاہب کی کسی بھی کتاب میں ارتقاء کا تصور نہیں ملتا۔ اُن سب میں یہی بات سامنے آتی ہے کہ خدا نے کہا ''کُن'' اور یہ کائنات وجود میں آ گئی۔ یعنی جس طرح سے جو چیزیں آج ہمیں نظر آتی ہیں، کُن سے یہ سب چیزیں اِسی شکل میں پیدا ہوگئیں، اور اِسی شکل میں اُسی طرح سے پہلے دن سے آج تک چلی آرہی ہیں۔

تین سو سال پہلے (ماسوا یونانی فکر میں جیسا کہ ارسطو میں دیکھا جاسکتا ہے) تک ہمارے ہاں حکماء کا بھی عمومی تصور یہی تھا کہ دنیا میں جتنی چیزیں موجود ہیں، وہ اِسی شکل میں سامنے آگئیں۔ خود آدمی کے متعلق تو یہ بہرحال تورات اور دنیا کی بیشتر کُتب میں موجود ہے کہ خدا نے پہلے ایک آدمی کو پیدا کیا اور پھر اُس کی بعد اُس کی پسلی سے عورت کو پیدا کر دیا۔ ساری کائنات کے متعلق یہ چیز چلی آرہی تھی کہ یہ چیزیں اسی طرح سے پہلے حکم کے ساتھ اُس شکل میں وجود میں آگئیں، جس شکل میں یہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں نظریہ ارتقاء کی دریافت میں حُکماء اور خصوصاً حُکمائے یونان نے جو کاوشیں کی ہیں، اُن کا مُختصر جائزہ لیا جائے اور پھر اُن کاوشوں کو قرآن کی روشنی میں بھی پرکھا جائے۔

قدیم یونانی فلاسفروں کا نظریہ ارتقاء:

فلسفہ کے علم کی ابتدا کا سہرا تھالیس (Thales) کے سر پر باندھا جاتا ہے۔ وہ آج سے 26 سو سال کے لگ بھگ ہمارے دور سے پیشتر 624 قبل مسیح پیدا ہُوا اور 556 قبل مسیح فوت ہوا۔ اصولی طور پر اُس نے یہ نظریہ دیا کہ تمام مادی اشیاء کا بنیادی مادہ پانی ہے اور یہ کہ ہر چیز پانی سے نکلی ہے اور آخر کار دوبارہ پانی میں مِل جائے گی۔

انسانی تاریخ میں یہ پہلا ثبوت اور کوشش تھی کہ کائنات کو کسی خیالی یا تصوراتی طریقے پر بیان کرنے کی بجائے کائنات کی حقیقت کو فطری اور سائنسی طریقے پر بیان کیا جائے۔ یہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی نظریہ یا تصور کی بنیادی وجہ انسان کا عام مشاہدہ یا خیالی تشکیل کا عمل ہے۔

اُس کے بعد اناکسی مینڈر (Anaximander) کا تصور سامنے آتا ہے جو تھیلس کے اس اصول سے مُتفق تھا کہ مادی اشیاء کا بنیادی یا حتمی اصول مادہ ہی ہے، لیکن اس نے مادہ کو پانی کا نام نہیں دیا۔ اُس کے خیال میں اشیاء کا اصول جامد مادہ تھا وہ بے صورت، غیر متعین اور لامحدود تھا، جو مُختلف مراحل سے گُزر کے مُختلف اشکال اختیار کر لیتا تھا۔

اُس کے بعد اناکسی مینیز (Anaximenes) نے اپنے پیشرو کی طرح بے صورت، غیر متعین، لامحدود اور بے نام مادے کا انتخاب نہیں کیا، بلکہ اُس نے کائنات اور مادی دنیا کا بنیادی اصول ہوا کو قرار دیا۔ اُس نے کہا کہ یہ ہوا بھی غیر متعین

مادے کی طرح خلا میں پھیلی ہوئی ہے اور مسلسل حرکت میں ہے۔ یہی حرکت کا اصول ہوا کی بنیادی فطرت میں موجود ہے اور یہی اصول کائنات کے وجود میں آنے اور اس کے ارتقاء کا باعث بنا ہے۔

ہراکلیٹس 535 قبل مسیح میں پیدا ہوا اور کہا جاتا ہے کہ اس کی وفات 475 قبل مسیح بنتی ہے۔ اُس کے بقول ''تمام اشیاء آگ سے وجود میں آئی ہیں اور اسی میں واپس مِل جائیں گی۔''

ہراکلیٹس کا نظریہ تھا کہ آگ دراصل تغیر کی صورت ہے، اِس لئے تغیر وتبدیل کا عمل ہی حقیقی ہے۔ اس کے برعکس وجود یا مُستقل صورت کا قیام سب فریبِ نظر ہے۔ اُس کا مشہور قول ہے کہ حرکت اصل حقیقت ہے۔ دنیا کی ہر چیز مسلسل تغیر وتبدیل کے عالم میں ہے اور نئی نئی صورتیں اختیار کر رہی ہیں۔

ہراکلیٹس کہا کرتا تھا کہ چیز بظاہر یعنی باہر سے اگر ویسی ہی ہو جیسے پہلی تھی تو یہ صِرف اس کے مادے کے حُجم کی وجہ سے ہے لیکن اصل مادہ پہلے والا نہیں رہتا بلکہ بہتے دریا کے پانی کی طرح بدلتا رہتا ہے۔

اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ مادے کی مُختلف قسموں کی بنیاد فطری طور پر ایک ہی مادہ ہے تو پھر مادے کے موجود عناصر یعنی ہوا، پانی، آگ اور مِٹی کی مُختلف خاصیتوں کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے کہ پھر یہ بظاہر مُختلف خاصیتیں ایک خاص یا مخصوص خاصیت کیسے اپنائیں گی۔

اِس مسلۂ کا حل فیثاغورث (Phythagoreas) نے یوں پیش کیا ہے کہ:

مُختلف چیزوں کے خواص میں اتنے زیادہ اختلاف ہونے کے باوجود ان سب میں ایک صفت یا خاصیت آفاقی نوعیت کی پائی جاتی ہے جو کائنات کی ہر چیز میں یکساں موجود ہے، چاہے وہ چیز مادی یا تجریدی (خیالی) ہے۔ وہ صفت یہ ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں عددی ہیں اور یہ کہ اُن کو گِنا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں کسی ایسی کائنات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جس میں ''ہندسوں'' اور تعداد کا تصور نہ ہو۔ فیثاغورث کا کہنا تھا کہ کسی ایسی کائنات کا تصور تو کیا جا سکتا ہے، جس میں رنگ، ذائقہ نہ ہو اور بے وزن ہوں لیکن کسی دنیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس میں ہندسوں کا وجود یا ضرورت نہ ہو یا تعداد کا بالکل تصور ہی نہ ہو۔ یہی دنیا کے وجود میں آنے کے بنیادی اصول کا اہم ترین پہلو ہے۔

حکمائے مغرب نے انسان کے وجود کو نظریہ ارتقاء کی روشنی میں سمجھا اور سمجھایا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حکمائے قدیم کے فکر سے راہنمائی حاصل کی جائے، جن میں زیادہ تر ارسطو کے نظریہ پر انحصار کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی وضاحت ڈارون، مارگن، برگسان، رسل، ہیگل اور الیگزینڈر کے نظریات میں بھی ملتی ہے۔ جن کا تعارف آئندہ صفحات میں کرایا جا رہا ہے۔

دیمقراطس کا نظریہ:

نظریہ ارتقاء کا آغاز فلسفہ مادیت سے ہوتا ہے جس کا ابوالآباء دیمقراطس کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر شے

جواہر (Atoms) سے بنی ہے اور جواہر از روئے ہندسہ نہیں بلکہ مادی طور پر نا قابل تقسیم ہیں۔ ان قدیم مادیئین کا خیال تھا کہ کچھ بھی ہو، یوں ہی (اتفاق سے) نہیں ہوتا بلکہ ہر بات کسی سبب کے باعث ہوتی ہے۔

وہ جواہر کو لا یتجزیٰ (Indivisible unity) کہتے ہیں اس نظریہ کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ:

1۔ یہ تمام لا یتجزی اجزا (Atoms) مادی ہیں۔

2۔ ہر شے انہی ذرات سے مرکب ہے۔

3۔ جب یہ باہم مل کر کسی شے کو ترتیب دیتے ہیں، تو ان کے درمیان خلا (Empty space) رہ جاتی ہے۔

4۔ یہ ذرات نا قابل فنا (Indestructable) ہیں۔

5۔ یہ ہمیشہ سے حرکت میں ہیں اور ہمیشہ حرکت میں رہیں گے۔

6۔ جواہر تعداد میں لامحدود ہیں۔

7۔ تمام اقسام کے جوہر کی نوعیت ایک ہی ہے۔ ان میں فرق صرف شکل اور جسامت کا ہے۔

8۔ نفس انسانی بھی انھیں اجزاء سے مرکب ہے اور انسانی فکر ان اجزاء کی طبیعی ترتیب سے ظہور میں آتا ہے۔

ہیگل کا نظریہ:

اسی دیمقراطس کے نظریہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ہیگل کہتا ہے کہ کائنات ڈی بوئس کے سات معموں میں سمٹ گئی ہے۔

1۔ ماہیت، مادہ اور توانائی (The nature of matter and force)۔

2۔ مبداء حرکت (The origin of motion)۔

3۔ مبداء حیات (The origin of life)۔

4۔ ربطِ اشیائے فطرت (The orderly arrangement of nature)۔

5۔ مبداء شعور (The origin of simple sensation and consciousness)۔

6۔ مبداء فکر و لسان (Ratoinal thought and the origin of speech)۔

7۔ انسانی اختیار کا مسئلہ (The quetsion of the freedon of the will,)۔

ہیگل کے نزدیک پہلے چھ معمّے دو بنیادی اصولوں کے ماتحت حل ہو جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ مادہ اور توانائی غیر متبدل ہیں اور دوم یہ کہ ''کائنات میں عمل ارتقاء جاری ہے جس سے مفہوم یہ ہے کہ غیر ذی شعور اور غیر ذی حیات مادہ سے ارتقائی طور پر زندگی اور شعور پیدا ہو جاتے ہیں۔''

باقی رہا ساتواں معمہ یعنی انسانی اختیار و ارادہ کا مسئلہ تو یہ سوال ایسا ہے ہی نہیں کہ اسے کسی سائنٹیفک تحقیق کا موضوع بنایا جائے کیونکہ اس کی بنیاد ایک عقیدہ پر ہے جو وہم کا پیدا کردہ ہے۔ اس کا حقیقی وجود ہی نہیں۔

سمپسن کا نظریہ ارتقاء، زندگی کی ابتداء کیسے ہوگئی؟

نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں.....

اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کے قریب پہنچا جارہا ہے.....لیکن اس معمہ کا آخری نقطہ (یعنی زندگی کا نقطہ آغاز) وہ مقام ہے جو سائنس کے انکشافات کی دسترس سے باہر ہے۔ اور شاید انسان کے حیطہ ادراک ہی سے باہر..... کائنات کے آغاز اور سلسلہ علت و معلول کی اوّلین کڑی کا مسئلہ لاینحل ہے اور سائنس اس حد تک نہیں پہنچ سکتی..... یہ اوّلین کڑی راز ہے اور میرا خیال ہے کہ ذہن انسانی اس راز کو کبھی نہیں پا سکے گا۔ ہم اگر چاہیں تو اپنے اپنے طریق پر اس علت اوّلیٰ کے حضور اپنا سر جھکا سکتے ہیں۔ لیکن اُسے اپنے حیطہ ادراک کے دائرے میں کبھی نہیں لا سکتے۔

کائنات کی ابتدا کے نظریہ پر قرآن سے ایک جائزہ:

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کائنات کے آغاز کے وجود کے عمل کی یوں وضاحت کرتا ہے کہ:

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿۱۳﴾ (85:13)

وہ (خدا) ہر شے کی پیدائش کا، ایک پست ترین نقطہ سے ابتداء کرتا ہے، اور پھر مختلف ارتقائی مراحل میں سے گزار کر، شے کو نقطہء تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿۱۳﴾ اس آیت میں دو لفظ ہیں اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿۱۳﴾ ''يُبْدِئُ'' کے معنی ہیں ابتدا کرنا۔

سوال یہ ہے کہ یہ کائنات کیسے عدم سے وجود میں آ گئی؟ جب کچھ نہیں تھا، تو یہ کیسے بن گئی؟ یہ وہ نقطہ ہے، جس نے انسان کو ورطہء حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

اس سوال کے جواب میں پہلا انسان حیرت کے جس مقام پہ تھا، اسی مقام پہ آج کا انسان بھی ہے اور آخری انسان بھی حیرت ہی کے مقام پہ ہوگا کہ کائنات کی ابتدا کہاں سے ہوگئی؟ یہ سلسلہء کائنات کیسے وجود میں آ گیا؟ ظاہر پرستوں Literalists نے کہہ دیا کہ کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ کائنات وجود میں آ گیا۔ خدا پہ ایمان والوں نے کہہ دیا کہ خدا اس کو عدم سے وجود میں لے آیا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کہاں سے آ گیا؟ یہ مقام، عقل کے بس کی بات نہیں ہے، کیونکہ عقل انسانی محدود ہے اور خدا لامحدود ہے، اور لامحدود، محدود ذہن میں نہیں سما سکتا۔ ہمارا ذہن یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ کوئی شے عدم سے کس طرح وجود میں آسکتی ہے۔ یہ اشیاء موجود ہیں۔ ان کے وجود سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ وجود میں کیسے آ گئیں۔

آئن سٹائن جیسا عظیم سائنس دان بھی کہہ سکا تو فقط اتنا کہ:

''طبیعی سائنس نے اب تمام اشیاء کو حرکت میں تبدیل کر دیا ہے.....کائنات، جو ہمیں اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ ایک ٹھوس شے نہیں، جو فضا میں پڑی ہے۔ یہ شے (Thing) ہے ہی نہیں بلکہ عمل (Action) ہے یا حوادث (Events) کی عادت۔''

کائنات کی محسوس شکلوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے، اس کے لیے طبیعات کے پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کا مقولہ زبانِ

زدِعام ہے کہ:

نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیّر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لیے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔

خدا کو ماننے والے، ظاہر پرستوں Literalists، سے پوچھتے ہیں کہ تم کہتے ہو کہ کائنات ازخود وجود میں آ گئی ہے، تو بتاؤ کائنات ازخود کیسے وجود میں آ گئی ہے؟ اس کا تو ضرور کوئی خالق ہوگا، جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اس دلیل سے خدا کو ماننے والے سمجھتے ہیں کہ ہم خالق تک پہنچ گئے ہیں۔ اس کے بعد دوسری طرف سے اعتراض آتا ہے کہ جب تم خود مانتے ہو کہ بغیر خالق کے کوئی شے وجود میں نہیں آسکتی تو پھر جسے تم خالق کہتے ہو، جسے تم خدا کہتے ہو، وہ پھر بغیر خالق کے کیسے وجود میں آ گیا؟ اس کا جواب عقل انسانی نہیں دے سکتی۔ یہاں پہنچ کر ازخود موجود خالق کو ماننا ہی پڑتا ہے، ''فرض'' کرنا ہی پڑتا ہے، کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے، جس کا کوئی خالق نہیں ہے۔

حساب Mathematics میں ایک کلیہ ''فرض'' To Sum کرنے کا ہے۔ اگر فرض نہ کیا جائے تو حساب کا سوال نکلتا ہی نہیں۔ کیونکہ خدا کو فرض To Sum کرنے سے انسانی دنیا کے سوالات کا حل ملتا چلا جاتا ہے، اس لئے ہم خدا کو ازلی وابدی ''فرض'' کرتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں۔ ایک نہیں بلکہ تمام انبیائے کرام کی خدا کی طرف سے عطا کردہ تعلیم کے انسانی معاشرے میں مثبت نتائج یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ خدا کو ٹھیک فرض کیا گیا ہے۔

یُبْدِئُ: قرآن خدا کو فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ق (12:101) اور بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (6:101) کہتا ہے یعنی ابتداً (Origin) سے ابتدا کرنے والا۔ اس ابتدا سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ہر شے، جس طرح آج موجود ہے، کیا اسی طرح ابتداً سے وجود میں آ گئی تھیں؟

انسان کا ذہن تو موجودہ وجود ہی کو شے کی ابتدا سمجھتا چلا آ رہا تھا، لیکن 18 ویں صدی عیسوی میں یہ چیز سامنے آئی کہ نہیں! اشیاء کی ابتدا تو بہت ہی پست ترین حالت سے، حقیری حالت سے وجود پذیر ہونا شروع ہوئی ہے، پھر ہر شے مختلف ارتقائی مراحل میں گردشیں کرتی ہوئی، مختلف منازل طے کرتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی، موجودہ شکل یا ہیئت میں پہنچی ہے س۔

یعید یعنی عَوَدَ: اس کا مادہ ''ع و د'' ہے۔ اس لفظ کے معنی پلٹنا، لوٹنا اور کسی چیز کو اس طرح ارتقائی گردشیں دینا ہے کہ شے اپنے معاد یعنی تکمیل تک اس طرح پہنچ جائے کہ جس کے بعد مزید ارتقائی گردشوں کی ضرورت نہ رہے۔ ہم اس کو شے کی آخری منزل کہیں گے، جہاں آگے مزید ارتقائی گردشیں ختم ہو جائیں۔ گردشوں کے اختتام سے ارتقاء کی لامتناہیّت کا تصوّر بھی ختم ہو گیا، ورنہ ایک اور مشکل پیدا ہو جاتی کہ جہاں شے کی ابتدا معلوم نہ تھی وہاں شے کا ارتقاء ابدی ماننا پڑتا۔ صفتِ ابتداء و انتہا صرف خدا کی ذات کے لئے ہے۔ شے یعنی مخلوق کو ابتداً Origin میں تو آنا ہے، لیکن اس کے بعد اس کی انتہا بھی ہے۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر حامد میاں، نیویارک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیاتِ بعد الممات یا حیاتِ بعد الحیات

موت کے بعد زندگی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر دور میں زیرِ بحث رہا ہے۔ کچھ دن پہلے یوٹیوب پر لیری کنگ نے یہ سوال نیل ڈی گراس ٹائیسن سے پوچھا جو کہ فزکس کا ماہر ہے۔ مگر نیل ٹائیسن اس کا فیصلہ کن جواب نہ دے سکا۔ میں اس سوال پر غور و فکر کرتا رہا۔ میں نے اس سوال کو سمجھنے کے لئے ایک منفرد مگر آسان طریقہ اختیار کیا ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ سب کو آسان بھی لگے گا اور سمجھ بھی آسکے گا۔

کسی نے سوال کیا کہ کیا آپ کے ہاں طبعی موت کے بعد زندگی ہے؟

جواب ملا کہ کیا آپ کے ہاں طبعی موت سے پہلے زندگی ہے؟

اگر طبعی موت سے پہلے ہم میں زندگی ہو تو زندگی طبعی موت کے بعد بھی ہوگی۔

سب سے پہلے تو ہمیں اس سوال پر نظرِ ثانی کرنی ہے اور یہ طے کرنا ہے کہ آیا حیات بعد الممات کہنا صحیح ہے یا حیات بعد الحیات؟ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ انسان مرکب ہے دو اجزائے ترکیبی کا:

1۔ طبعی جسم/ اوزارِ بدن/ عمر اور یہ سب فزکس (Physics) میں آتے ہیں۔ اس بدن، اسکے اعضاء اور عمر کی ایک نہ ایک دن موت ہے۔

2۔ شعورِ خویش/ انسان کی ''میں'' (I am ness) کا کمانڈر اِن چیف ہونا یہ سب مابعد الطبعیات (Metaphysics) میں آتے ہیں اور اگر انسان کی ''میں'' اس دنیا میں زندہ ہے تو وہ طبعی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔

انسان کی ''میں'' ایک الوہیاتی توانائی (Divine Energy) ہے۔ اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ توانائی کو نہ ہی پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تباہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کو صرف ایک ترتیب سے دوسری ترتیب میں بدلا جا سکتا ہے۔

دوسری زندگی کا نظریہ کیا ہے؟

اس کو سمجھنے کے لئے ہم کسی ایک بیج کی مثال لیتے ہیں جیسے آم کا بیج جو کہ دیکھنے میں مردہ سا نظر آتا ہے مگر وہ مردہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر زندگی کی بیشمار ممکنات خوابیدہ انداز میں کروٹیں لے رہی ہوتیں ہیں اگر وہ بیج صالح ہے۔ اس بیج کو میں ''پہلی زندگی'' کہتا ہوں۔

اس بیج کے اندر چھپی ہوئی زندگی کی ممکنات کی نمود کے لئے کچھ حرکاتی عناصر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے کہ مٹی، پانی، سورج کی حرارت وغیرہ۔ یہ حرکاتی عناصر اس بیج کی نشوونما میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ اور یہ بیج پھلتا پھولتا ہوا ایک تن آور آم

کے درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس میں پھول اور پھر پھل لگتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کس طرح ایک بیج یعنی ''پہلی زندگی'' کتنی ہی نئی زندگیوں کو ممکن بنانے کے قابل ہوسکتی ہے۔ یعنی اس آم کے اندر جو بیج جنم لے رہے ہیں وہ ہیں ''دوسری زندگی (Next Life or Life After)'' وہ بیج اس آم کے خول (Pattern) کے اندر رہتے ہوئے ہی پختہ یا mature ہو سکتے ہیں۔ اگر اس خول میں کسی وجہ سے بھی سوراخ ہو جائے تو نہ ہی وہ آم پکتا ہے اور نہ ہی وہ بیج دوسری زندگی پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہ ہے وہ مردہ بیج جس میں سے زندگی نمودار نہیں ہوتی۔ اب ہم اس آم کی مثال سے انسانی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔

کیا انسان دوبار پیدا ہوتا ہے؟

1۔ انسان کی پہلی پیدائش طبعی/حیوانی یا بغیر اختیار وارادہ کے ہوتی ہے۔ یہ اس کے اختیار وارادہ میں نہیں ہوتا کہ وہ کس مذہب کے گھرانے میں پیدا ہو۔ وہ انسان وہی کچھ بن جاتا ہے جو وہ اپنے گھر اور معاشرے سے سیکھتا ہے۔ یہ ساری ابتدائی تعلیم و تربیت اس کے اختیار وارادہ کے بغیر ہوتی ہے۔ اسکو اس بات کا شعور ہی نہیں ہوتا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتا چلا جاتا ہے جبکہ اسکی ساری ابتدائی تعلیم اسکی مرضی کے بغیر ہوئی تھی اور اس طرح کے انسان حیوانی سطح پر ہی رہتے ہیں۔ وہ جانوروں کی طرح اپنا تحفظِ خویش کرتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں اور افزائشِ نسل کر کے مرجاتے ہیں۔ جسے نفسیات کی دنیا میں ''unlived life'' کہتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (7:179)

اور وہ لوگ جو اپنے عقل وشعور سے کام نہیں لیتے وہی لوگ تو ہیں جو جانوروں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ بلکہ اُن سے بھی بدتر کیونکہ انہوں نے قرآنی اقدار سے لاتعلّقی کا رویہ اختیار کر رکھا ہوتا ہے۔

اور انسان وہ کہلانے کے لائق ہوتا ہے جو انسان اپنے اختیار وارادہ اور عقل وشعور سے اپنی ابتدائی تعلیمات کا تنقیدی جائزہ لے جو کہ بغیر اختیار وارادہ اسے دی گئی تھیں۔ اور پھر خود فیصلہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچے کہ وہ اپنے اختیار وارادہ سے کیا بننا چاہتا ہے۔

جسے قرآن لاالہ سے تعبیر کرتا ہے:

2۔ انسان کی دوسری پیدائش اسکی ذات کی پیدائش ہوتی ہے جب وہ اپنے آپ کو جاننا شروع کرتا ہے کہ وہ حقیقت میں کون ہے۔ جسے خود آگہی، شعورِ خویش یا Self Realization کہتے ہیں۔ اور یہ اس انسان کا اپنے متعلق جاننا اس کے اپنے اختیار وارادہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے تحت الشعور میں پڑے ہوئے پہلے عقیدوں اور خداؤں کو ٹٹولتا ہے جو اسکی ابتدائی زندگی میں کسی نے اس کی اجازت کے بغیر ڈال دیے تھے۔ اور پھر وہ ان سب عقیدوں اور خداؤں کی نفی کرتا ہے جو باطل پر مبنی تھے۔ اس کے بعد وہ انسان اپنے اختیار وارادہ کے ساتھ اپنی ذات اور کائنات کے متعلق نئے نظریات اور عقائد قائم کرتا ہے۔ یہ انسان کی زندگی میں ایک بہت ہی مشکل، دردناک اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے جسے ہر انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ انسان کی دوسری پیدائش کو سرسید احمد خان نے اپنی ایک چھوٹی سی مگر بہت ہی جامع تحریر ''گزرا ہوا زمانہ'' میں بہت ہی حسین انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی پیدائش کے لئے قرآن کے اندر انسانیت کے لئے ایک عظیم قانون، theory یا کلمہ

قیامت تک کے لئے رکھ دیا گیا ہے۔

''لا الہ الا اللہ'' نفی کرو ہر اس باطل عقیدے اور باطل خدا کی جو تم نے اپنے تحت الشعور میں بسا رکھا ہے اور پھر حق اور اللہ کے قوانین کو اپنے تحت الشعور میں بسا کر ان کی نگہداشت کرو اور ان کے مطابق اپنی عملی زندگی کے راستے طے کرو۔

جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے یہ مرحلہ شاہین کی زندگی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ مہینوں اس دردناک اور المناک مرحلے سے گزرتا ہے۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا ہے جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگرو خود گرو خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے
(علامہ اقبالؔ)

انسانی غلامی کی بدترین قسم:

آیئے اب ہم انسان کی ذات یا اس کی "میں" کے بارے میں غور کریں۔ یہ طبعی شئے نہیں ہے بلکہ مابعد الطبیعات یا Metaphysical ہے۔ اور انسان اپنی فکری ارتقا کی اس منزل پر اس کا ادراک بھی نہیں کر سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ انسان اپنی اگلی منازل میں اس کی کُنہ وحقیقت کا احاطہ کر سکے۔

چونکہ مابعد الطبعیات کا وجود طبعی کائنات کے اندر ناممکن ہے اسلئے اس ''انسانی مَیں'' کے اوپر ایک طبعی خول پہنا دیا گیا ہے تا کہ وہ طبعی دنیا میں perform یا operate کر سکے۔ جسے اُس ''میں'' کے طبعی اوزار کہتے ہیں جو اُس ''میں'' کے تابع ہوتے ہیں۔

کائنات کی ہر مادی چیز جو اس ''میں'' کے گرد و نواح میں ہے وہ اپنی نسبت ''میں'' کے ساتھ رکھتی ہے مگر وہ ''میں'' نہیں ہوتی۔

Every material thing is relative to "I" but is not "I" because "I" is metaphysical

اس لئے ہمارا جسم ہماری ''میں'' کے لئے لباس/خول (Pattern) یا اوزار کا کام دیتا ہے۔ اس انسانی ''میں'' کی نشوو نما اسی صورت میں ممکن ہے اگر انسانی ''میں'' اور انسانی جسم کے اعضاء و جوارح غیر متبدّل اقدار کے تابع رہ کر کام کریں۔

انسانی ''میں'' یا commander in chief of human body انسانی جسم یا اسکے اوزار کو حکم دیتی ہے اور وہ اوزار اس "میں" کا حکم بجالاتے ہیں۔ اسطرح اسباب وعلل کا عمل جاری رہتا ہے۔ جس میں انسانی "میں" سبب یا cause بنتی ہے اور انسانی جسم علّت effect۔ اس طرح مابعد الطبیعات، metaphysical body طبعی جسم Physical body کے اندر رہتے ہوئے اپنی نشوونما کا سامان اور زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے تا کہ وہ زندگی کے اگلے مراحل طے کر سکے۔

اس cause and effect کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اب اپنی توجہ کو ایک خاص موضوع ''آدم اور ابلیس کی داستان'' کی طرف مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔

داستانِ آدم کے ابتدائی صفحات میں ہی کچھ عقلمند انسانوں (ابلیس کی مجلس) کو یہ بات سمجھ آ گئی کہ اگر ہم دوسرے انسانوں

کی ''میں'' یا commander in chief، کہ جس میں حرارت ہے، جو کہ سبب Cause بنتا ہے کسی Effect کا، اسکو چھین لیں تو باقی ان کے پاس مٹی کے پتلے رہ جاتے ہیں جن کو ہم اپنی مرضی سے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح کچھ خود بین حضرات (جنہیں قرآن ابلیس یا شیطان کہہ کر پکارتا ہے) نے پوری انسانیت کی "میں" یعنی commander in chief کو چھین کر انہیں اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ وہ نفسیاتی غلامی ہے جس کو محسوس کرنا بھی بہت دور کی بات ہے۔ انسان اس غلامی کا اس حد تک خوگر ہو چکا ہے کہ وہ جتنا اس کے اندر رہے اتنا ہی خوش رہتا ہے اور اپنی مرضی سے رہتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ "اللہ کا شکر ہے کہ مجھے نوکری مل گئی" یہاں نوکری کا لفظ غور طلب ہے۔

کیا انسان کی فطرت ہوتی ہے؟

جب سے حضرتِ انسان نے اس مادی کائنات میں آنکھ کھولی ہے۔ اپنے ہی جیسے انسان کی ہوس کا شکار رہا ہے۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکاری ہے

اور خاص طور پر آج کی مہذب دنیا میں جب انسان کو:

Newtonian Physics and Freudian Psychology, Darwinian Evolution نے ایک سماجی حیوان یا Social Animal تصوّر کرتے ہوئے اس پر حیوانی دنیا کے قوانین نافذ کر دیئے تو یہ حیوانی سطح سے اوپر نہ اٹھ سکا۔ اور اسی animalistic life/circular life کے گھن چکّر میں الجھ کر رہ گیا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ (47:12)

اور وہ لوگ جنہوں نے قرآنی اقدار کا انکار کیا اور اسی مادی زندگی کو ہی اپنا نصب العین سمجھا اور حیوانات کی طرح زندگی بسر کرتے رہے ان کا انجام جہنّم ہے۔

اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ انسانیت کی تاریخ میں ہر لکھاری یہی لکھتا چلا آیا کہ انسان کی فطرت (human nature) ہوتی ہے۔ اور پھر انسانی فطرت ایسی ہے اور انسانی فطرت ویسی ہے کے افسانوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

آیئے آج ہم اس بات کا فیصلہ بھی کر لیں کہ آیا انسان کی فطرت ہوتی بھی ہے یا نہیں۔

جیسا کہ ایک مغربی مفکّر A.N. Whitehead نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی نظریہ یا لفظ سمجھ نہ آئے تو پہلے اس کو define کر لیا کرو تو آدھا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

تو چلئے آج ہم یہ تجربہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ فطرت کسے کہتے ہیں۔

حیوانات، نباتات اور جمادات کی دنیا میں اگر آپ نگاہ دوڑائیں تو آپ حیران ہوں گے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اختیار و ارادہ کی قوت نہیں ہے۔ ان سب کے سامنے ایک ہی راستہ ہے جو وہ اختیار کر سکتے ہیں۔ اسلئے حیوانات، نباتات اور جمادات سب فطرت/ nature کہلاتے ہیں۔ یعنی وہ شئے جو اپنے آپ کو اپنے ارادے سے تبدیل نہ کر سکے۔ مثلاً سورج یہ خود فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ کل مغرب سے نکلے گا اور شیر گوشت کی جگہ گھاس کھانا شروع کر دے یا آم کا درخت یہ فیصلہ

نہیں کرسکتا کہ وہ آم کی جگہ مالٹے پیدا کرلے۔ کیونکہ ان تمام اشیا کی تقدیر لکھی ہوتی ہے۔ یعنی جو اپنے آپ کو تبدیل نہ کرسکے یا نہ کرنا چاہے۔ ان دونوں صورتوں میں وہ فطرت کے زمرے میں آجائے گا۔ اور فطرت اپنے اعمال کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ چونکہ فطرت programmed ہوتی ہے اسلئے سبب نہیں بنتی effect ہوتی ہے اور کوئی effect کبھی بھی اپنے عمل کا accountable نہیں ہوتا۔

ان انواع میں انسان ہی ایسی نوع ہے جس کی فطرت نہیں ہوتی اور وہ اپنے آپ کو کسی وقت بھی بدل سکتا ہے۔ انسان کی تقدیر لکھی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ یہ خود اپنی تقدیر اپنے ارادوں اور اعمال سے مرتّب کرتا ہے۔ چونکہ انسان کے پاس اختیار وارادہ ہے اور اسکے ہر خیال اور عمل میں دو ممکنات/ possibilities ہوتی ہیں اسلئے انسان سبب بنتا ہے اور جو سبب بنتا ہے وہ اپنے خیالات اور اعمال کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اسکی accountability / پوچھ گچھ ہے۔ ہاں جو انسان کسی وجہ سے اپنے آپ کو بدل نہیں سکتا، مجبور ہے اور یا وہ بدلنا نہیں چاہتا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ حالات، زمانے یا انسانوں کا غلام ہو چکا ہے۔ اپنی زندگی حیوانی سطح پر بسر کر رہا ہے (sheeple)۔ اور حیوانات فطرت ہیں۔ اب اس کی فطرت ہے کیونکہ غلام اپنی ''میں'' اختیار وارادہ یا commander in chief کھو چکا ہوتا ہے اس لئے یہ کسی دوسرے کی ''میں'' کا effect ہوتا ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات تو جھکا جو غیر کے آگے، نہ من تیرا نہ تن
(علامہ اقبالؒ)

مگر یہ یاد رہے کہ اُس انسان کی فطرت نہیں ہوتی جو انسانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے۔

جنّت/خیر/حسنات (Heaven/Good) اور جہنّم/شر/سیّئات (Hell/Evil) کسے کہتے؟

جنّت/خیر (Heaven/Good) اور جہنّم/شر (Hell/Evil) اور انسان کی اُخروی زندگی/ next life انسان کے اندر کی پیداوار ہوتی ہیں۔ یہ حضرتِ انسان ہی جنّت، جہنّم اور اگلی زندگی کا سبب بنتا ہے۔ ان تینوں نظریات کی بانی انسان کی "میں" ہوتی ہے۔ یہی وہ میں/ commander in chief ہے جو اپنے صحیح اور غلط خیالات اور اعمال کے ذریعے ان تینوں نظریات کو جنم دیتا ہے۔ ان تینوں نظریات کی ابتدا انسان اس مادی یا پہلی زندگی میں ہی شروع کر دیتا ہے اور یہ اس انسان کے اختیار میں ہوتا ہے کہ اپنے لئے جنّت تیار کرے یا جہنّم۔ اپنی نوشت اپنے قلم سے لکھ کر اگر تو انسان جنّت تیار کرتا ہے تو اسے حیاتِ جاوید/ آگے جانے والی زندگی بھی ملتی ہے۔ اور اگر جہنّم تیار کرتا ہے تو وہ آگے جانے والی زندگی میں رکاوٹ ہے۔ یعنی جہنّمی زندگی وہ ہے جو ایک جگہ پر رک جائے، جامد ہو جائے، جہیم ہو جائے اور جہنّم میں چلی جائے اور آگے جانے والی زندگی کے قابل نہ ہو۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ ''انسان پیدا ہوتے ہی اپنی زندگی کو گروی رکھوا دیتا ہے اپنے خیالات اور اعمال کے بدلے میں۔'' اگر اس کے خیالات اور اعمال حسنات ہیں تو وہ جنّت اور اُخروی زندگی پاتا ہے اور اگر اس کے خیالات اور اعمال سیّئات ہیں تو وہ جہنّم پاتا ہے۔ اب اس بات کا تعین کس طرح کیا جائے کہ حسنات اور سیّئات کیا ہیں؟

تو سُنیئے، حسانات وہ انسانی خیالات اور اعمال ہیں جو قرآنی اقدار/ Permanent Values کے تابع اور مطابق ہوں جن کا فائدہ اُس انسان کو بھی ہو اور پوری انسانیت کو بھی ہو۔ یہ قرآنی اقدار ہی وہ انسانی سانچہ یا Human Pattern ہے جس

کے اندر رہ کر انسانی ''میں'' اور انسانی جسم perform کریں۔ اور یہ قرآنی اقدار انسانی ''میں'' کی تکمیل کا ذریعہ بنیں۔

وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ (13:17)

جو عمل نوع انسان کیلئے نفع بخش ہوتا ہے وہی عمل اس دنیا میں ہمیشہ رہتا ہے۔

اور سیّئات وہ انسانی خیالات اور اعمال ہیں جو قرآنی اقدار کے تابع نہ ہوں بلکہ ان کے خلاف ہوں اور جن کا نقصان اس انسان کو بھی ہو اور پوری انسانیت کو بھی ہو۔ جو خیالات اور اعمال قرآنی اقدار یا Human Pattern سے باہر رہ کر perform کریں وہ انسانی ذات یا ''میں'' کو disintegrate/ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات
(علامہ اقبالؒ)

شیطان اور ابلیس کسے کہتے ہیں؟

جو عمل بھی قرآنی اقدار یا Human Pattern سے باہر رہ کر کیا جائے وہ عمل شیطانی عمل کہلاتا ہے اور جو انسان اس عمل کو perform کرتا ہے وہ انسان شیطان کہلاتا ہے۔ اور ہر شیطانی عمل کا آخر کار نتیجہ مایوسی یا disappointment ہے اور عربی زبان میں ابلیس کا مطلب مایوسی بھی ہے۔

ملخص اقتباسات:

1۔ انسان ہی صرف ایسی مخلوق ہے جس کی فطرت نہیں ہوتی۔
2۔ انسان کی پہلی پیدائش بے اختیار (حیوانی) ہوتی ہے اور دوسری با اختیار (انسانی) ہوتی ہے۔
3۔ انسان کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے جہنّم تیار کرے یا جنّت تیار کرے۔
4۔ انسان کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی اُخروی زندگی کو طبعی موت سے پہلے اپنے اندر جنم دے یا موت دے۔
5۔ طبعی غلامی سے کہیں بدتر ہے آج کی نفسیاتی غلامی۔
6۔ آدم ہی وہ مخلوق ہے جو اپنے اختیار و ارادہ سے جو چاہے بن جائے۔
چاہے تو حیوان بن جائے، چاہے تو شیطان، چاہے رہے ابلیس یا انسان بن جائے۔

سانحہ ارتحال

پیشاور سے اطلاع ملی ہے کہ شیر افضل خان اس دُنیا میں نہیں رہے۔ مرحوم طلوع اسلام ٹرسٹ کے بانی ٹرسٹیوں میں سے تھے اور قدیم ترین رفقاء قرآنی میں سے تھے۔ دعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔ ادارہ طلوع اسلام مرحوم کے اہلِ خانہ، پس ماندگان اور احباب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

قرآنی پمفلٹس

صحیح قرآنی فکر کو عام لوگوں تک پہنچانے میں قرآنی فکر پر لکھے گئے چھوٹے پمفلٹس نے بھی بہت ہی اہم اور کامیاب کردار ادا کیا ہے۔ احباب اِن پمفلٹس کا خود بھی مطالعہ کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو تقسیم بھی کرتے ہیں اس لئے اِن کی قیمت اصل لاگت سے بہت ہی کم رکھی جاتی ہے۔ جبکہ کچھ صاحب ثروت احباب اِس کمی کو اپنے عطیات سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ یہ سلسلہ ابھی بھی محدود پیمانے پر جاری ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اِس سلسلہ کو مزید بہتر کیا جائے لہٰذا صاحب ثروت حضرات سے مزید عطیات کی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ قرآنی فکر کے کام میں مزید وسعت پیدا کرنے میں ہماری مدد کریں اور اپنے عطیات ''پمفلٹس فنڈ'' کے لئے بھجوائیں تاکہ پمفلٹس کی طباعت اور دوسروں تک قرآنی فکر کو پہنچانے میں ہم کامیابی حاصل کرسکیں۔

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات کی کل آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف ہوتی ہے

رقم بذریعہ منی آرڈر۔ بینک ڈرافٹ بنام ادارہ طلوع اسلام B-25 گلبرگ 2' لاہور ارسال فرمائیں۔
بینک اکاؤنٹ نمبر 7-3082 برانچ کوڈ 0465 نیشنل بنک آف پاکستان۔ مین مارکیٹ گلبرگ' لاہور۔

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 6: Tears of passion (*Shola-e-Namnaak* شعلہ نمناک) –

To my fellow travelers

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1962)

Episode No: 2

Our program

We have a similar program in front of us, my friends. Our mission is to spread the Quran's teaching. This requires that we should first understanding it ourselves; and then to convey it to others through literature. But it is equally important that our practical life must also provide its proof through our exemplary character and moral behavior. This program of action is a never ending continuous process. But there is a difference between the Quranic program and those missionary's program. They attract people by standing silently. This is a negative aspect of life and Christianity's special teaching. The Quran brings out the positive aspect of life and declares that this is the right method to invite people to its teaching. It is this method that was recommended to Ibrahim (PBUH) who, having been deeply disturbed by the state of his people, asked Allah how to revive dead nations: وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰىؕ (2:260) – Each Messenger has been confronted with the problem of giving life to a dead nation. For instance, Abraham faced such a problem and said to Allah: "What is the process by which new life may be infused into a dead nation?" What was the process prescribed by Allah? It was: قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًاؕ (2:260) – Allah explained the process to Ibrahim through an example. He said: "Take four untamed birds. At first they will try to get away from you. Make them familiar with yourself gradually. This will bring about remarkable change in them. Even if you set them free and call to them, they will come to you swiftly." This is how you also, my friends, must patiently but quietly reform those who rebel against your call; and try to bring them closer to yourself, and make them understand and appreciate the Divine System. This is how you will be able to instill "life" into them.

This is a positive program unlike any other program. And there is no place in it of any kind of commotion. Leave aside commotion, even if there is a mild sound or unexpected motion then it will have undesirable effect in the training process. Therefore, one has to be extremely cautious and extraordinarily patient in this process; and one must adhere to an already settled program by remaining one-hundred percent focused on its goal. It is obvious that this program requires steady flow like a river and steadfast determination like a

rock. *This* is *our* program of propagating the teachings of the Quran, my friends. And *this* is the program that we must adhere to, and abide by. In the methodology or the process of this program there may be some changes in the means by which this program is carried out depending on the needs of the times; but there is absolutely no place in it of rallies and demonstrations, no matter what. If some people are getting impatient then so be it. We cannot change the principles on which the program is based for their sake. Those who join this movement should clearly understand that, here, it is to burn like a moth not to make noise like rooster.

Obstinate people

There is another point that needs to be kept in mind: There are obstinate people – mostly religious obscurantists – that you need to keep away from. These are the people about whom the Quran says that they have already made up their minds not to listen to anything that deviates from their preconceived notions: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (2:6) – As opposed to متـــين (*Muttaqeen*), there are كافرين (*K'afireen*) who see the right path clearly, yet do not adopt it, being impelled by their obstinacy, jealousy, vanity, and vested interests. They do not follow this path themselves, and also prevent others from following it. Whether or not the كافرين (*K'afireen*) are warned about the disastrous consequences of following the wrong path, it is the same for them. They will never adopt the right path. These are the people about whom the Quran says to the Prophet (PBUH) to stay away from: وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (73:10) – Do not be depressed by what your opponents say about you. Ignore them and remain firm and steadfast on your program. Do not get involved with them. Save yourself by gracefully withdrawing from these people who are not prepared to even listen to you. So, there is no need to waste your time and energy on such people who are stagnant, obstinate, and prejudiced. It is not hard to identify such people if you pay close attention to their mien. These are the people about whom Allama Iqbal says:

They protect their outer shell but ignore their inner essence;
They leave aside the mature kernel and go after the chafes;
They keep the heart of the message far away from themselves;
They surrender the special message and protect the rituals!

So, please convey the Quranic thought to those who want to understand it with reason and knowledge and who are interested in solving the practical problems of humanity. The Quran addresses only those who have within them symptoms of life, and want to elevate themselves on the scale of humanity. It says: لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا (36:70) – O Prophet (PBUH)! This code of life has been given to you so that you may warn the nation which still exhibits signs of life and wants to survive. This is the fertile soil in which the seed of thought germinates and eventually becomes a giant tree – and about which Allama Iqbal has said:

Iqbal is not that hopeless from his barren farmland;
As it only takes a little moisture to make it fertile land!

***

Our ignorant friends

The second thing I want to draw your attention to is even more important than this, my friends. It is popular theme that is commonly invoked: "An open enemy is better than an ignorant friend." I can't say how an open enemy is better but I do experience frequently how an ignorant friend can be quite harmful. These "ignorant friends" are part of our movement. Some are even members of Bazms and have been studying Tulu-e-Islam's literature for a long time. But they propagate such wrong ideas about this movement and about me personally that I get quite astonished. May Allah protect us from such "friends?"

I believe the enemies of this movement do not cause as much harm as the uncalled favors do of these so-called friends. These people have turned out to be very dangerous to this movement and, therefore, they need to be stopped. The way to do this is as follows:

(1) If someone asks you about anything related to Tulu-e-Islam's mission; its beliefs; or my ideology etc.; then first see if the answer is given in any book, pamphlet, or magazine published by Tulu-e-Islam. If it is, then give that piece of literature to him.

(2) If you cannot find the answer in any literature published by the Idara then tell him that I don't have the knowledge about it. Give him the address of the Idara and ask him to find the answer directly from there.

In short, don't give verbal answers to such questions yourselves. The authority is of written words. Present him the written document. Verbal statements come under the category of narrations. Don't entangle yourselves in narrations.

I am requesting every Bazm to keep a close eye on its members. If any member violates this guideline then warn him. If he continues to violate the guideline despite the warning then know that he has joined this movement to deliberately harm it. Protect your Bazm from such people.

At this point I want to declare that Tulu-e-Islam is responsible for only those things that it has *written* its literature. It is not responsible for anything else that is attributed to it.

***

Our practical life

Now my dear friends, I am coming to most important aspect of this address. You are deeply passionate about understanding the Quranic teaching. This is very good thing. But simply understanding the Quran is not the goal by itself. It is understood for the purpose of leading our life according to its message. If the Quran's teaching does not change our character and behavior then it is no more than just a mental pleasure. If the

Quran's teaching does not create such revolution deep inside our hearts that is not reflected by our daily life then such an understanding is nothing but applaud of poets, which is of no benefit.

Even if the intellect tells that there's no god except Allah;
If the heart and mind aren't Muslim then life is nothing!

The expression of being Muslim means that the heart and mind are Muslims, and that this must be reflected in our character and behavior. If our character is not clean; if our vision is not lofty; if our manners and behaviors are not kind and humane – then what is the difference between those whom we say that they don't understand the Quran? This is nothing but deceiving ourselves by saying that we understand the Quran better than them? Well, those who understand the Quran, their daily life must distinguish them from others? And anyone who interacts with them in any matter should get impressed by their beautiful character and immediately assert: here is a good person in an era of human drought. There is no doubt that we want to create Quranic revolution in society. But it does not mean that we have to wait for that society in order to mold our character according to the Quran. Of course there are certain things that cannot happen without changing the society. But why wait for things that can be done individually, like improving our character and manners. Making the society a shield for our weaknesses is a great self-deception. It is unbecoming of those who take the name of the Quran to remain in such self-delusion. Truthfulness, brotherhood, love, kindness, good manner, trustworthiness, keeping promise, broadmindedness, openness in dealings, cleanliness in character, clearness in thought, pure intellect, protecting honor – these should be our distinguishing features at all times. I have mentioned these only as examples. In a nutshell, please understand that our life should be molded on the pattern of the life-model of the Prophet (PBUH) because this is *the* necessary consequence of understanding the Quran. If this does not happen then everything becomes useless.

It is also necessary that we should live a dignified and serious life. We should make sure nothing happens from us that is degrading. Our daily life should be civil and gentlemanly. We should live in peace and wish for peace and security to others. We should never commit any wrong or harm anyone. Our life should reflect kindness and justice.

Pakistan's security

It is also important that nothing should happen from us that weakens the security of Pakistan. This is because all our efforts and all our hopes and aspirations for practically establishing the heavenly Quranic society are tied to the safety and security of this land. For common people this piece of land is just a country but for us it is an essential means to live Quranic life, and an escape hatch from the current hell that humanity is in. From this the importance of its security should be quite obvious

to us. We are surrounded by shortsighted Hindus on one side who are determined to take revenge of their centuries old slavery and subjugation; and on the other side there is flood of communism.

Against this monumental flood covering the entire Earth;
Intellect, wisdom, sense, and knowledge are just straws!

Religious extremism and fire

But then there are elements within the nation that were against the creation of Pakistan in the first place, and are still a source of destruction from within. These elements, under the cover of religion, want to inflame and destabilize the country. They want to take revenge by creating chaos and destruction for that unceremonious defeat they suffered when Pakistan became a reality despite their opposition, and their ego was hurt badly. If you look carefully at this situation then you will find that most of these religious groups are the very ones that were fighting against Pakistan movement and Tulu-e-Islam, because it was supporting the Pakistan movement on the basis of Islam and دین (*Deen*). On the other hand, they were using Islam and دین (*Deen*) as a shield to wage their battle against the creation of Pakistan. These are the same wounds that are still festering in their hearts for their defeat then. These people will try to incite you in every which way but you should not fall into their trap. You must remain calm and cool despite their provocations. You kept your patience and calm under the recent incendiary situation they created in the country when one thousand so-called Islamic scholars published a fatwa against me declaring me an infidel. There was no report of any emotional reaction against this fatwa from any Bazm or any of its members. You deserve my heartfelt congratulations for this!

Sectarianism and political parties

You know that our movement is very much against creating division in the Ummah – whether it is in the name of religion or politics – because it is antithesis of دین (*Deen*). دین (*Deen*) is the flagbearer of the unity of humankind whose first step is the unity of Ummah. Therefore, nothing should happen from us that has even an inkling of creating division. Since participating in politics is not in our program, we have nothing to do with political machinations and the resulting partisan circuses. There is only one program in front of us, and that is: to understand the Quran and to propagate its teaching; and to create such a change in our own selves and in others in the Ummah that our society progressively gets transformed on Quranic lines. Our way is that:

We don't talk about historical traditions, rituals, piety, creed, or religion;
But we do passionately and boldly talk about the teachings of the Quran!

The law of permanence and change

My dear friends, if there is an error or mistake in whatever I present and if anything in it is not according to the teachings of the Quran then time will erase it. And whatever is according to the Quran in my presentation – it will stay alive despite all the

opposition against it. This is because in the Universe permanence and change occurs according the law of Allah. يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (13:39) – The basic law of evolution is that those species which acquire the capacity to survive remain whilst the rest are eliminated. This law, the source of which is with Allah, also applies to nations. Therefore, if there is something according to the Quran and our current period does not accept it then a future period will accept it. If our message is based on truth then I have one hundred percent conviction that:

Every outline of the sign of time will call on me;
Never think that my story is only limited to me!

Gratitude

My dear friends, when I look back I am amazed how every step of the program that I had in front of me about thirty years ago has been achieved despite lack of resources. While I am totally grateful at every step of the way to Allah and prostrate before Him, I am also thankful to you from the depth of my heart because without your sincere love and affection I would not have been able to cover this long and difficult Quranic journey. Whatever I have presented so far it was limited to Urdu speaking people of the country. But now, not only I want to include the English speaking people of this country but I also want to convey this message to the thinkers and researchers of the West as well, who seem to be eager and desperately in search of a system of life that can only be found in the Quran. You will be happy to note that, by the Grace of Allah, I have started this work in English. [This book is now published entitled, Islam: A challenge to Religion]

Establishment of school

The last step of this program is the establishment of s school that will teach and train the next generations so that their hearts and minds could be molded on the Quranic pattern; and their full potentials are actualized so that they could work for the development and welfare of humanity. It is obvious that this program requires lot of resources and demands great courage. But:

Lack of resources cannot stop the passion and drive for the goal;
The intensity of passion creates its own thrust and way to the goal!

It is this deep-rooted conviction and the determination to achieve my goals that have carried me throughout my life.

Muslim's life is built on conviction and cultivation of deep-rooted wish;
Every generation must keep faith that "Allah doesn't break His promise!"

My practice has been that at any time a program came in front of me I immediately knocked at the door of the Almighty and extended my begging bowl in front of Him just like the brothers of Ibrahim (PBUH) did: وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ

(12:88) – Take this amount and out of pity for us give us provisions in full measure and be bountiful to us.

And I found that the Merciful One never let me return empty handed. But even more uplifting is the message that was given to the Prophet (PBUH): وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۝ (13:40) – As already stated, O Prophet (PBUH), you might wonder whether the end of which your opponents are being warned will come about in your life time or whether you will spend your whole life in these struggles. The end will come according to Our Law of Requital. Your responsibility is only to communicate the message with full confidence that they will be recompensed for their actions since it is Allah Who keeps a watch over what they do.

Therefore, why should we worry about as to when our program will be completed? All we are told is this:

Keep passionately striving and have faith;
Finding the way sometimes is itself wealth!

So, we must passionately keep striving without worrying about the result. If our program is according to the Quran; if our intentions are sincere; and if there is steadfastness in our commitment – then there is no reason that sooner or later the beneficial result won't be achieved because: وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۝ (12:56) – Allah does not waste the efforts of those who do good (balanced) work. This is the promise of Allah and His promise is always true. As for the opposition to the Quranic program, do not worry about that. I have an eye on the world and I see how humanity is suffering under the wrong system of life and how it is desperately in search for the correct way of life. Allah's system is not limited to any particular space and time. Allah addresses the entire humanity. Therefore, opposition to the Quranic system at one place cannot stop its success in other places. No power can stop the demands of time. Please tell those who want to stop the voice of the Quran:

The prison is under your control but it is not;
The blooming of flowers in the spring season!

It is a fact that: وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ (12:21) – Allah has every power to carry out His plans although most people do not know this.

***

To be continued.....

اس امر کو واضح کر دینا ضروری ہے کہ ادارہ طلوع اسلام کا ملکی یا غیر ملکی کسی بھی سیاسی پارٹی یا فرقہ سے براہِ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی ادارہ طلوع اسلام خود کوئی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ ہے۔ یہ صرف اور صرف ایک فکری اور علمی تحریک ہے۔ (چیئرمین ادارہ)

8-مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔ دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

9-مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔ دین اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

10-مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔ دین اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

11- مذہب کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔ دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے (القرآن)۔

12-مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔ دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

13-مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم و دلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔ دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔

14-مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)، سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔ دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوع انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔

15-مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔ دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 70
ISSUE
8

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/



اُمید، ہمت اور خود اعتمادی

میرے ہم وطنوں کے لیے یہی میرا پیغام ہے

(قائداعظمؒ کا قوم سے خطاب، 24 اکتوبر 1947ء)